لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ، وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

اے سارے مُلکوں کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیدے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے۔ اور تو جسے چاہے عزت دے اور تو جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے، بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

(سورۂ آل عمران۔۲۶)

हे अल्लाह! राज-सत्ता के स्वामी! तू जिसे चाहे राज्य प्रदान करे और जिससे चाहे राज्य छीन ले और जिसे चाहे सम्मानित करे और जिसे चाहे अपमानित करे। तेरे ही हाथ में भलाई है। निस्सन्देह तुझे हर चीज़ का सामर्थ्य प्राप्त है।

क़ुरआन मजीद

O' Allah! Owner of sovereignty!

Thou givest sovereignty unto whom thou wilt, and thou withdrawest sovereignty from whom thou wilt. Thou exaltest whom thou wilt and thou abasest whom thou wilt. In thy hands is the good. Lo! Thou art able to do all things.

(HOLY QURAN.)

Regd No. LW/NP 56

Phone 22345 29747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مجمع بحار الانوار

(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لئے بے نظیر کتاب)

تالیف:۔ ملک المحدثین علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی (المتوفی ۹۸۶ھ)

اس کتاب کے بارے میں تمام دنیا کے علماء اور ماہرین فن حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ اپنے موضوع پر منفرد اور بے نظیر ہے، جو اپنی جامعیت اور فنی رعایتوں کے اعتبار سے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے فائق ہے۔ الفاظ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کی لغوی مشکلات اور دیگر مباحث کے لئے یہ کتاب گویا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں لغوی تحقیق اور فنی بحثیں ایسی بسط اور معتدل طریقہ پر کی گئی ہیں جو طالب علم کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے اور حدیث کے مرجع کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے۔

ہندوستان ہی نہیں بلاد عربیہ کے علماء نے بھی اس کی عظمت اور اہمیت کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب عرصہ سے نایاب تھی، قدر دانوں کی طلب بلکہ ان کے اصرار پر اب خدا کا شکر ہے کہ نہایت آب و تاب اور عربی ٹائپ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ اچھے کاغذ پر۔ پہلی بار۔ محدث شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی مدظلہ کے گرانقدر مقدمہ اور محقق لغات مولانا عبد الحفیظ بلیاوی کی تصحیح و تنقیح کے بعد ۵ جلدوں میں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے طبع کر کے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری کر دی ہے۔

کتاب کے مجموعی صفحات سوا تین ہزار سے زیادہ ہونے کے باوجود۔ نفع عام اور علم دین کی خدمت کے جذبہ سے۔ پورا سیٹ لینے والوں کے لئے اس کا ہدیہ صرف ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپے رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں

مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی لیبل، نقلی کیپسول اور ٹین کے ڈھکن سے ہوشیار!

نورانی تیل

درد۔ زخم۔ چوٹ۔ جلنے۔ کٹنے کی دوا۔

اب سنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیے۔

انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

Noorani Tel

ہند تیل

ہر قسم کے جسمانی درد، چوٹ، زخم، موچ، جلنے، کٹنے و ہر اچانک گھریلو حادثہ کا فوری علاج ہے۔ اس کی مسلسل مالش کرنا بچوں کو تندرست و توانا بناتی ہے۔

تیار کردہ:۔ ہند سی۔ سی ورکس۔ مئوناتھ بھنجن یوپی

"تعمیر حیات" میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجیے

شربت نزلہ

معمولی کھانسی، زکام اور نزلہ کے لیے

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸

حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل

بہترین چائے کا قابل اعتماد مرکز

عبّاس علاء الدین اینڈ کمپنی

اسپیشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپیشل ممری	گولڈن ڈسٹ
ہوٹل مکسچر	فلاوری او پی

AA

TELEGRAM:- CUP. KATTLY

PHONE No 332220

زر اشتراک اندرون ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپئے ششماہی سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرون ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ و کناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید ممالک: ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپئے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپئے

تعمیر حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۴ | ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۷۷ء | ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۹۷ھ | ۱۱

اسلام تغیر پذیر دنیا میں

اسحٰق جلیس ندوی

(قسط ۲)

منگل ۲۵ جنوری کی دوپہر کو پروفیسر محمد شفیع پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی صدارت میں سیمینار کا اختتامی جلسہ ہوا۔ صدر جلسہ نے سیمینار کی کامیابی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور مندوبین کا شکریہ ادا کرکے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے اختتامی خطاب کی فرمائش کی۔

مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ یہ خوش آئند بات ہے کہ علوم اسلامیہ اب کسی مخصوص جماعت کا موضوع نہیں رہے بلکہ جدید دانش گاہوں میں بھی علوم اسلامیہ پر غور و فکر، مطالعہ اور تحریر کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، یہ سیمینار اس کی دلیل ہے ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اسلام میں علمائے دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ نہیں۔ پریسٹ ہڈ (Priest hood) کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے اس کا دخیلہ اسلام میں کہیں وجود نہیں، لیکن میں یہ بات عرض کروں گا کہ ماہرین (Experts) اور متخصصین (Specialist) کا وجود ہمیشہ رہا ہے۔ اور یہ ایک ایسی علمی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ علوم میں اسقدر وسعت اور تنوع پیدا ہوگیا ہے کہ ایک شخص کے لئے ہمہ داں ہونا عملاً ناممکن ہے۔ یورپ میں بھی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار ہوئی اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہوگئے۔

دوسری بات مولانا نے یہ فرمائی کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جارہا ہے، جس محنت، لگن اور عشق کی ضرورت ہے ہمارے فضلاء میں اس کی بڑی کمی ہے۔ آج اکیڈمیاں، بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں لیکن دس بیس سال گذر جانے کے بعد بھی وہ ایسی کوئی پیشکش نہیں کرپاتے جنہیں دیکھ اس علم کے ماہر اسے اوریجنل (original) کہیں، بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا یہ مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے ؎

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

تیسری بات مولانا نے یہ فرمائی کہ علوم اسلامیہ کا تعلق ایمانیات سے ہے اس لئے ہمارا طرز عمل اس سے ایک مستشرق کا سا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسلامیات پر جب ہم لکھ رہے ہیں تو اس پر ہمارا ایمان بھی ہونا چاہیئے اور عملی زندگی میں اس کی نمود بھی ہونی چاہیئے۔

چوتھی چیز یہ کہ کسی مسئلہ پر ہماری تنقید خالص علمی اور اکیڈمیک ہونی چاہیئے۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ علوم اسلامیہ پر کام کرنے والوں کو عربی زبان سیکھنے کی طرف خاص طور پر توجہ دینی چاہیئے۔ عربی زبان کے بغیر علوم اسلامیہ پر کام اور اس کے ماخذ سے استفادہ ممکن نہیں۔

اپنی اختتامی تقریر کے آخر میں مولانا نے فرمایا کہ یہ دور انتشار ہے طبیعتیں بہت جلد انتشار کا اثر قبول کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے اہل قلم کو ہر ایسی بات سے گریز کرنا چاہیئے جو ذہنی اور فکری انتشار پیدا کرے۔

مسلم یونیورسٹی کیمپس (Campus) میں اس سیمینار کے روشن پہلو پر جب بھی کسی سے گفتگو ہوئی تو اس نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی افتتاحی تقریر اور اختتامی ہدایات اور مشوروں کو حاصل سیمینار کہا۔ مولانا کے اختتامی خطاب کے بعد پروفیسر انوارالحق صاحب حقی نے سیمینار کی مقرر کردہ سب کمیٹی کی مرتب کردہ تجاویز منظوری کے لئے پیش کیں۔ ان تجاویز میں ایک تجویز پر کچھ اختلافی نقطۂ نظر سامنے آیا بقیہ تجویزیں بالاتفاق منظور ہوگئیں۔

آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خسرو نے کہا کہ ہم نے اپنے اس علمی سفر کا آغاز ندوۃ العلماء کے اجلاس سے کیا جہاں ہمیں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے مدعو کرکے اظہار خیال کی دعوت دی، ہمارے اس سفر کی دوسری منزل جامعہ ملیہ اسلامیہ تھی جہاں ہم نے دسمبر میں جمع ہوکر "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" پر غور و فکر کیا۔ اب ہم علی گڑھ میں اکٹھے ہوئے ہیں اور گذشتہ چار دن ہمارے علمی مذاکرات اور تبادلۂ خیالات سے علم و تحقیق کے نئے گوشے سامنے آئے، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملی اس کے بعد وائس چانسلر صاحب نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا "اب آئیے دیوبند چلیں" دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع پر ہم پھر ملیں گے اور ہمارا یہ اجتماع عہد جدید کے مسائل کو اسلام کے ابدی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔ وائس چانسلر صاحب نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشوروں کا شکریہ ادا کیا اور اس کی تائید کی۔

یہ تو تھی اس سیمینار کی مختصر سی روداد، مفصل روداد اور پڑھے گئے مقالات کو منتظمین یقیناً کتابی شکل میں شائع کریں گے۔ البتہ بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اہل علم کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ یہ ہیں:۔

۱۔ کسی بھی تصنیف، تقریر یا مجلس مذاکرہ کے لئے موضوع کا تعین بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سیمینار کا موضوع تاویل پسند ذہن کے لئے خاص گنجائش رکھتا ہے خصوصاً ان حالات میں جب فضا زیادہ سازگار نہ ہو۔ بعض مندوبین نے اس عنوان سے اپنے اختلاف کا بھی اظہار کیا۔ بدرالدین طیب جی (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے یہ ترمیم پیش کی کہ "اسلام تغیر پذیر دنیا میں" کے بجائے "مسلمان تغیر پذیر دنیا میں" زیادہ موزوں تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سیمینار کے موضوع "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" پر بھی محتاط حضرات کا یہی احساس تھا۔

۲۔ سیمینار میں پڑھے گئے مقالات اور بحث و گفتگو کے معیار کو بہتر بنانے کی طرف کسی حضرات نے متوجہ کیا، خوب سے خوب تر کی تلاش اختلافی چیز بھی نہیں، جو کچھ پیش کیا گیا اس سے بہتر کی امید ہر شخص کو تھی۔

۳۔ سیمینار میں مندوبین کی اکثریت عصری علوم کے فضلاء کی تھی اس میں مزید توازن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ دینی درسگاہوں میں شمالی ہند کے علاوہ جنوبی ہند میں بھی ایسی شخصیتیں مل جائیں گی جنہیں دینی علوم میں رسوخ کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا بھی اندازہ ہے۔

۴۔ علم و دانش اور عالم و دانشور پر اقتدار کا کالا سایہ کبھی نہ پڑے تو بہتر ہے اور ایسا ہونا

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس نگرامی ندوی

تبلیغ کا طریقہ

اُدعُ الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (نحل-۱۶)

اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو عقلمندی اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ، اور ان سے اچھے طریقے سے مناظرہ کرو۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ اپنے اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو تین طریقوں سے بلائیں: (۱) حکمت (۲) اچھی نصیحت (۳) اچھے طریقے کا مناظرہ!

جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں تو عام طور سے تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت میں دل میں گھر کرنے والی دلیلیں پیش کرتے ہیں، یا سچے دل سے نصیحت کرتے یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے توڑتے ہیں اور اس کی غلطی ظاہر کرتے ہیں۔

پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا اچھی نصیحت اور تیسرے کا نام اچھے طریقہ کا مناظرہ ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دین میں زبردستی نہیں! ایمان یقین کا نام ہے اور یقین کسی کے دل میں زبردستی نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ غور کرو کہ مسلمانوں میں صحابہؓ سے بڑھ کر ایمان اور اسلام میں کون ہے؟ کوئی ایک صحابی بھی زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا تھا۔ سب رسول اللہؐ کی اچھی زندگی دیکھ کر اور اچھی باتوں کو سن کر ایمان لائے تھے۔ تم بھی آج اسی طریقہ سے اللہ کے دین کی تبلیغ کرسکتے ہو۔ رسول اللہؐ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی طرف لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا تو رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ اللہ کے دین کو آسان کرکے پیش کرنا، سخت بناکر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا۔

جو کہو وہی کرو:

لم تقولون ما لاتفعلون (صف ۱)

تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

تم جو کچھ زبان سے کہو، اس پر خود عمل بھی کرو، نہیں تو تمہارے کہنے سننے کا لوگوں پر کچھ بھی اثر نہ پڑے گا۔ قرآن میں ہے:۔

کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (صف ۱)

بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔

خدا نے فرمایا، کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہتے تھے اس کو خود بھی کرتے تھے، لوگوں کو غریبوں، اور مسکینوں کی امداد کا حکم دیا، تو پہلے خود امداد کرکے دکھا دیا، معاف کرنے کی نصیحت کی تو اپنے زہر دینے والوں کو خود معاف بھی کیا، جنھوں نے آپ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ الغرض تم دوسروں کو نصیحت کرو تو خود کو بھول نہ جاؤ۔

رشتہ داروں کے ساتھ برتاؤ:

یا ایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا۔ (تحریم-۱)

اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ۔

جس طرح اولاد کے ذمہ ماں، باپ کا حق ہے، اسی طرح ماں، باپ کے ذمہ اولاد کا بھی حق ہے، اس آیت میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ یعنی ان کو تمام ایسے کاموں سے روکنا چاہیئے جن سے دین اور دنیا برباد ہو، اچھی تعلیم اور اچھی پرورش کا خیال رکھنا چاہیئے سچی محبت، روپیہ، کھانا، کپڑا، زیور اور بڑے بڑے گھروں میں نہیں ہے۔ سچی محبت تو اسی میں ہے کہ ہم بیوی بچوں کو اللہ کے غضب سے بچائیں اور ان کو دوزخ کا ایندھن نہ بننے دیں۔

خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کی بخشش کی دعا مانگتے ہیں اسی طرح وہ اولاد کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں۔

واصلح لی فی ذریتی (احقاف-۲)

اور میری اولاد میں صالح بنا۔

محسن انسانیت نے فرمایا

★ غریبوں کے ساتھ دوستی رکھو، امیروں کی مجلس سے احتراز کرو۔
★ جو ضامن ہے وہ تاوان کا ذمہ دار ہے۔
★ قضا کو دعا ہی ٹالتی ہے۔
★ سچا اور امین تاجر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔
★ جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو دین میں نہیں ہے وہ رد ہے۔
★ تجارت میں رزق کے ۹ حصے ہیں۔
★ مومن کے لئے موت، اس کے رب کی طرف سے تحفہ ہے۔
★ موت ایک ایسا راستہ ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔
★ سب سے پاکیزہ کمائی ان تاجروں کی ہے جو لین دین میں جھوٹ نہیں بولتے اور اہل معاملہ سے وعدہ کرتے ہیں تو وعدہ خلافی نہیں کرتے۔
★ جو شخص کسی عیب دار چیز کو، اس کا عیب خریدار پر ظاہر کئے بغیر بیچ دے اللہ کبھی اس سے خوش نہیں ہوگا (یعنی جب تک اس کی تلافی نہیں کرتا)
★ جو کاروبار میں راست باز ہیں، بروز حشر وہ سایہ عرش کے نیچے ہوں گے۔
★ کاروبار تجارت میں غلط سلط قسمیں مت کھاؤ۔
★ جو اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرے گا، دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی کیجائیگی۔
★ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دیدی جائے۔
★ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تین آدمیوں پر میں خود دعویٰ کروں گا ان میں سے ایک جو مزدوروں کی مزدوری مارے۔
★ اطمینان سے کام کرنا اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جلدی کام کرنا شیطان کی طرف سے۔
★ میری طرف سے احکام دینی پہونچاتے رہو خواہ وہ ایک آیت ہی ہو۔
★ خدا اسے آباد رکھے جس نے میری باتیں سنیں اور دوسروں کو پہنچائیں۔
★ نماز پڑھانے والے کو چاہیئے کہ نماز مختصر پڑھائے کہ مقتدیوں میں بوڑھے، کاروباری اور بیمار سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔
★ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکی کو پسند کرتا ہے، نظیف ہے اور نظافت اسے پسند ہے۔
★ اللہ تعالیٰ میل کچیل اور پراگندہ حالی کو پسند نہیں کرتا۔
★ صاف ستھرے رہا کرو کیونکہ اسلام پاکیزہ مشرب ہے۔
★ جسم کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے۔
★ میری امت میں بُرے ہیں وہ لوگ جو اعضا کی پرورش (زیب و زینت) میں لگے رہتے ہیں۔
★ بڑا بھائی باپ کی جگہ ہے۔
★ اپنے استادوں کی توقیر کرو۔
★ بُرا ساتھی گویا آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔
★ اپنی غلطی کا اقرار بلا تامل کرلو۔
★ مسکرانا خدا کی طرف سے لیعنی پسندیدہ چیز ہے۔
★ بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والا دوزخ میں جائے گا۔
★ اعمال میں میانہ روی اختیار کرو۔ اور ایسی روش ترک کردو جو تمہارے لئے باعث دشواری ہے۔
★ سوار پیدل کو سلام کرے، پیدل بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کو سلام کریں۔
★ تم میں سے کسی نے کہیں شادی کا پیام دیا تو دوسرا وہاں پیام نہ لے جائے جب تک پہلا دستبردار نہ ہوگیا ہو۔
★ تمہارے غلام ان کے معاملہ میں انصاف کرو۔ ان کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ جو خود کھاؤ انہیں کھلاؤ جو خود پہنو انہیں پہناؤ۔

میں شکوک و شبہات اور غیروں کو کتر بیونت کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ہمارے پاس نشر و اشاعت کے وسائل نہیں جس سے ہماری طرف منسوب کسی غلط بات کی تردید کرسکیں۔

۵ — دینی مدارس اور علماء کو مشورے مختلف مقالات اور تقریروں میں سُنے گئے اس کے بارے میں حسن ظن تو یہی کہتا ہے کہ ملک کے عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی علماء کو اور زیادہ باوقار، باخبر، بااثر اور بااختیار دیکھنا چاہتے ہیں — دینی مدارس اور اس کے فضلاء کی کمی، کمزوری بے خبری اور عدم واقفیت انہیں گوارا نہیں۔ لیکن یہ مسئلہ مزید غور و فکر کا محتاج ہے۔ دینی مدارس میں سب سے قدیم عظیم اور بااثر ادارہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس درس گاہ کے بانیوں یا بعد کے دور کے ذمہ داروں نے کبھی اس بات کا اعلان نہیں کیا کہ ہم ایسے علماء تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف علوم دینیہ میں ماہر ہوں تو دوسری طرف عصری علوم کے فاضل۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر تمام مدارس اپنے مقصد قیام میں کامیاب ہیں، برصغیر میں علم دین کی حفاظت و اشاعت۔ دینی مدارس و مکاتب کے قیام، مساجد کی آبادی، نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت اور عوام الناس کی دینی حمیت ان میں دین کے بقا اور شعائر اسلامی کے احترام میں سب سے بڑا فیض دارالعلوم دیوبند اور اس کے فضلاء کا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی میں ناکامی کے بعد مغرب سے آئے ہوئے سیلاب سے دینی شعائر کی حفاظت و بقا کا مقصد پیش نظر رکھنے والا ادارہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہے اور اس کے فرزندوں کی اس سلسلے میں کی ہوئی کوششیں اور قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانی ارکان کے پیش نظر عصر حاضر سے واقف وسیع النظر علماء پیدا کرنا تھا" انہوں نے عصری علوم کے ماہرین پیدا کرنے کا عزم کیا نہ اسے مقصد بنایا۔ ندوہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہے، اس نے ایسے فضلاء پیدا کئے جنہوں نے اپنی وسیع النظری، عصر حاضر سے واقفیت، وقت کے اسلوب میں تحریر و تقریر، عربی اور اردو زبان و ادب میں صلاحیت اور علمی و تحقیقی ذوق کی بنا پر قدیم و جدید دونوں طبقوں کا اعتماد حاصل کیا ان کی تحریر ہر طبقہ پڑھتا ہے، ان کی تقریر کا عصر حاضر کا باخبر اور نباض انسان بھی وزن محسوس کرتا ہے۔

ندوہ اپنے مقصد و تخیل کے اعتبار سے بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس نے نہ صرف اردو زبان و ادب کو ایک نیا علمی اور سنجیدہ رخ دیا بلکہ عربی زبان میں بھی اس کے فضلاء نے تصنیف و تالیف اور صحافت و خطابت کے میدان میں عالم عربی سے خراج تحسین حاصل کیا۔

علی گڑھ تحریک کے بانی نے ایم۔ اے۔ او کالج کی بنیاد ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہاں کے طلبہ کے ایک ہاتھ میں سماجی علوم دوسرے ہاتھ میں سائنس اور ٹکنالوجی اور سر پر کلمۂ طیبہ کا تاج ہوگا۔

برصغیر کے ان تمام تعلیمی اداروں کا سلسلۂ نسب جہاں عصری علوم سکھائے جاتے ہیں علی گڑھ تحریک سے جا ملتا ہے۔ ان عصری درس گاہوں میں ملت کے نوّے فیصد طلبہ گذشتہ سو سال سے تعلیم پاکر نکل رہے ہیں۔ ان طلبہ کی اکثریت اعلیٰ اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ملت کے ان نونہالوں اور نوجوانوں کی اکثریت دین کے مبادیات، اسلامی تاریخ اور دینی شخصیتوں کے حالات و خدمات سے ناآشنا رہتی ہے۔ سماجی علوم، ادب و لٹریچر، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کامرانیوں یا ناکامیوں کا بے لاگ جائزہ ایک وسیع موضوع ہے اور آج یہ ہمارا موضوع بھی نہیں۔ ہمیں سر کے تاج کی تلاش ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں ایک طبقہ اگر دینیات اور ملت کی تاریخ سے کچھ واقف بھی ہے تو یہ ذاتی مطالعہ، دینی جماعتوں سے وابستگی اور خاندانی ماحول کا نتیجہ ہے۔ چند تعلیمی اداروں میں شعبۂ اسلامیات کے قیام سے تمام مسلمان طلبہ کی اسلامیات سے واقفیت کی ضرورت قطعاً پوری نہیں ہوسکتی۔

ملک میں پرائمری اسکول کی سطح سے اعلیٰ تعلیم کے کالجوں تک سیکڑوں ایسے عصری تعلیمی ادارے ہیں جن کا نظم و انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے اگر دینیات کی تعلیم کا ایسا نصاب تیار کیا جاتا اور ایسے ان اسکولوں اور کالجوں میں Cultural Activities اور Moral Science کے گھنٹوں میں پڑھائے جانے کی تحریک اور کوشش ہوتی تو اس سے ایک بڑی کمی پوری ہوسکتی تھی۔

بمبئی کی انجمن خیر الاسلام نے اس قسم کا نصاب تیار کیا ہے اور اس انجمن کے زیر انتظام تمام اسکولوں میں تعلیمی اوقات میں یہ نصاب پڑھایا جاتا ہے — ایک علاقائی تعلیمی انجمن جب یہ خدمت کرسکتی ہے تو مسلم یونیورسٹی تو بدرجہ اولیٰ روز اوّل سے یہ اہم خدمت انجام دے سکتی تھی۔ دینی مدارس میں عصری تعلیم کی ضرورت کے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جدید تعلیمی اداروں میں دین و اخلاق کی تعلیم کی فکر کی جائے۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ زیادہ غور و عمل کا محتاج ہے کیونکہ ہمارے نوّے فیصد طلبہ کی ذہنی نشو و نما دین ناآشنا نظام تعلیم و تربیت میں ہوتی ہے اور یہی طلبہ مستقبل میں قوم رسول ہاشمی کے قائد بلکہ قائد اعظم قائد ملت اور قائد عوام بنتے ہیں۔

عصری علوم کی جامعات کو دینی مدارس سے کہیں زیادہ وسائل حاصل ہیں، اس کے باوجود ان کے شعبۂ اسلامیات، شعبۂ عربی اور شعبۂ فارسی کی علمی اور تحقیقی کارکردگی خاصی مایوس کُن ہے۔

علی گڑھ تحریک نے برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے سلسلے میں پُرجوش قائد اور کارکن تو ضرور فراہم کئے لیکن اسلامی ریاست کی تشکیل و تعمیر کے سلسلے میں کوئی سائنٹفک بنیاد اور وقیع لٹریچر نہیں پیش کیا۔ اس اہم کام کے لئے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا گیا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ کتاب "اسلام کا سیاسی نظام" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:—

"سنہ غالباً ۱۹۴۰ء تھا، یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا کہ ارباب لیگ کو خیال یہ پیدا ہوا، کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شد و مد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانون اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہئے، اور اسی غرض سے یوپی کی مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کردی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کرکے لیگ کے سامنے پیش کرے، اس مجلس نظام اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں۔ (۱) مولانا سید سلیمان ندویؒ (۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۳) مولانا آزاد سبحانی (۴) عبدالماجد دریابادی — باقی دو ممبر غالباً اور تھے، ان کے نام اب ذہن میں نہیں . . . .

مجلس کے مصارف کے کفیل نواب صاحب چھتاری قرار پائے اور انہوں نے ایک رقم اسی وقت مجلس کو عطا بھی کردی . . . . . . مجلس کا تمہیدی اجلاس دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے ہال میں ہوا جس میں لیگ کے اکابر بطور وزیٹر شریک تھے مجلس کے داعی (کنوینر) علامہ ندوی قرار پائے موصوف کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ کتاب کا ابتدائی مسودہ مولانا حکیم محمد اسحاق ندوی سندیلوی تیار کریں . . . . . ."

سماجی علوم میں اسلامی نقطۂ نظر اور دینی تعلیمات کی نمائندگی کی ذمہ داری دینی مدارس سے زیادہ علی گڑھ تحریک پر تھی۔ جدید تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم کی بقدر ضرورت گنجائش و سہولت پیدا کرنے میں علی گڑھ تحریک کو پیشقدمی کرنی چاہیے تھی۔ — برصغیر کے جدید تعلیمی ادارے علی گڑھ تحریک سے جتنے متاثر اور قریب تھے دینی مدارس کا ان پر اتنا اثر نہیں تھا، گذشتہ ایک صدی میں ہماری جو دین ناآشنا نسلیں جدید دانشگاہوں سے نکلیں اور ان میں سے بڑی تعداد ان نظریات اور تحریکوں کی علمبردار بنی جو اسلام سے متصادم تھیں اس میں علی گڑھ تحریک کے بانی کے مقصد و تخیل سے ان کے جانشینوں کی روگردانی کو بڑا دخل ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے یہاں اسلامی موضوعات پر کانفرنس منعقد کرکے قدیم و جدید طبقہ کو باہم مل بیٹھنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع دیا — اس قسم کے سیمینار اگر مختلف مسلک و خیال کے افراد میں اپنی تنگ دامانی اور بے رنگی کا احساس پیدا کرکے انہیں کمی اور خامی کی تلافی کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوں تو یہ بہت بڑا نفع ہے۔

★★

تاریخ کی کہانی — قطب مینار کی زبانی

ماضی، حال اور مستقبل کے آئینہ میں

تحریر: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — ترجمانی: منصور نعمانی ندوی

میری طبیعت دہلی کے ہنگاموں سے اُوب گئی تو میں تسکین دل محزوں کے لئے دہلی کے ویرانوں کی طرف چل نکلا، اور قطب مینار جا پہونچا، قطب مینار ہزاروں یادگاروں کا مدفن، انقلابات زمانہ کا عینی شاہد سیکڑوں سال سے عظمت رفتہ کو روتا ہوا اپنی جگہ قائم ہے، قطب کو دیکھ کر اندرون دل یہ احساس ابھرا کہ انسان کس قدر ناپائدار ہے اور یہ اینٹ، چونے اور سنگ سرخ سے تعمیر شدہ لاٹ کس قدر مستحکم اور پائدار ہے۔ انقلابات زمانہ قطب کو نہ ہلا سکے، دہلی کے خون خرابے اس کو نہ اجاڑ سکے، ہنگامے اس کی رونق کم نہ کرسکے، ۱۸۵۷ء کا تاریخی غدر اور ۱۹۴۷ء کا ہوشربا ہنگامہ اس کا بال بیکا نہ کرسکے،

میں قطب مینار کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میرے کانوں سے یہ صدا ٹکرائی "اے آدمی سُن!" میں حیران ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، مجھے موہوم اندیشوں سے جھرجھری سی آنے لگی میں نے اس کو وہم سمجھ کر گوشۂ خیال سے جھٹکنا چاہا لیکن دوبارہ پھر وہی آواز آئی تو مجھے خیال ہوا کہ شاید مینارہ اپنی آپ بیتی سُنانا چاہتا ہے، میرے جذبات تاثر کو مینارہ نے بھانپ لیا اور اس نے زبان بے زبانی میں کہنا شروع کیا، "مجھ سے ڈرو نہیں میں پتھر کا ہوں لیکن جو قادر مطلق تم کو نطق و گویائی عطا کرسکتا ہے وہ کیا مجھے قوت گویائی عطا نہیں کرسکتا؟"

مجھے مینارہ کی اس بات سے ڈھیرج ہوئی تو میں نے سوالیہ نظریں مینارہ پر گاڑ دیں، اس نے کہنا شروع کیا، "یہاں میں ۷۰۰ سال سے زیادہ سے کھڑا ہوں اس طویل مدت میں لمحہ بھر کے لئے میں نے پلک نہ جھپکائی، میں زمانے کے انقلابات، بادشاہوں کا اقبال و زوال دیکھتا رہا، میری حیثیت چکّی کے پاٹ کی سمجھ لیجئے جس کے ارد گرد حوادث و انقلابات کا پہیہ گردش کرتا رہا میں نے اس مدت میں عجیب و غریب تماشے دیکھے، ایسے بھی جو میرے لئے وجہ سکون ہوئے اور ایسے بھی جو میرے لئے سوہان روح بنے، مگر ایمان کی یہ ہے کہ ایسے حوادث سے زیادہ سابقہ رہا جنھوں نے ہنسایا کم اور رُلایا زیادہ، بخدا اگر میں "سنگدل" نہ ہوتا تو شدتِ الم سے میرا کلیجہ کب کا پھٹ چکا ہوتا؟

لیکن اس شکستہ خاطری کے باوجود میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس طویل مدت میں میں نے ایسے نیک طینت انصاف پسند، بادشاہوں اور علم و فن کا سنگم، تقویٰ و طہارت کی آبرو علماء صلحاء کو دیکھا جن کے وجود مسعود نے میرے زخمائے جگر کا اندمال کردیا، سچ پوچھیے تو یہ خوش قسمت گھڑیاں میرے اوراق زندگی کا حسین و انمول سرمایہ ہیں اور انہی اوقات پارینہ سے یادوں کا چراغ روشن کئے ہوئے ہوں۔

جب ہندوستان میں اسلام کا نام لیوا کوئی نہیں رہا اور اسلام کا روشن چراغ آندھیوں تلے دب گیا تو رحمت الٰہی جوش میں آئی، اس کا ظہور قافلہ سالار اسلام سلطان محمود غزنوی سے ہوا، وہ رعد و برق کی سی چمک گرج کے ساتھ ہندوستان آیا اور قوت ایمانی سے دیو ہیکل راجاؤں کو شکست دی، اس سے یہ بات ثابت ہوکر رہی کہ اصل چیز عددی برتری و بالادستی نہیں بلکہ اصل سرمایہ ایمان و آگہی کی قوت ہے تاریخ اسلامی کے اوراق ایسے ایمان افروز واقعات سے لبریز ہیں۔

ڈیڑھ سو برس کے بعد سلطان شہاب الدین غوری صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ وہ جیالا، بہادر سپوت تھا، جس کی قوت و مردانگی سے ہندوستانی مسلمانوں کے اکھڑتے قدم جم گئے، اور اس سرزمین ہزار رنگ کو انہوں نے اپنی نگاہوں کا مرکز، اپنے ارمانوں کی بستی بنالیا، یہیں سے ان کی حکومت کی بنیاد پڑی کہنے کو تو یہ بھی بڑی فتح تھی لیکن اصل فتح دلوں کے فاتح خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیریؒ کے ہاتھوں ہوئی، ان کی بدولت لاکھوں افراد کو اسلام کی دولت بے بہا نصیب ہوئی۔ انہی کی دعاء و مناجات سے خدا نے غوری کو غلبہ عطا کیا، شاعر اسلام اقبالؒ نے صحیح کہا ہے ؎

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

میں نے اس جیالے بادشاہ غوری کو دیکھا نہیں اس لئے کہ مجھے اس کے نیک طینت، درویش صفت سادہ دل جانشین قطب الدین نے مسجد قوۃ الاسلام کے مینارہ کے طور پر بنایا تھا، میری ہوش کی آنکھیں کھلیں تو دورِ اسلام کی جھلک دیکھی، غلام و آقا، شاہ و گدا، امیر و غریب کا فرق اس دور میں ختم ہوئی، عدل و انصاف، رواداری و مساوات کے مظاہرے عام ہوئے، غلام سروری و سرداری کے میدان میں جلوہ گر ہوئے، شہاب الدین نے اپنے غلام قطب الدین کو تخت و تاج سپرد کرکے ایثار نفسی اور اخوت اسلامی کا مظاہرہ کرکے ایک مثال قائم کردی، قطب الدین نے بھی اپنے غلام شمس الدین کو تخت و تاج سپرد کرکے اس روایت میں چار چاند لگائے، غرض کہ ۸۸ سال تک غلاموں کی حکومت چلتی رہی اس مدت میں ایسے انصاف پرور سلاطین ہندوستان کو نصیب ہوئے جس پر وہ فخر و ناز کرسکتا ہے ان بادشاہوں کے کارنامے تاریخ میں زریں حروف سے مرقوم ہیں۔ ان قابل ذکر بادشاہوں میں قطب الدین، شمس الدین، سلطان ناصر الدین، غیاث الدین بلبن ہیں۔ سلطان شمس الدین کے زمانہ میں ایک جلیل القدر ہستی سے دہلی بہرہ مند تھا، یہ ہستی ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن قطب الاولیاء شیخ بختیار کاکیؒ کی تھی۔ جو بات میں اب کہنے جا رہا ہوں اس پر شاید کسی کو یقین نہ آئے لیکن تاریخ کے سینہ میں یہ واقعہ اب بھی امانت ہے کہ شمس الدین شیخ کی خدمت میں رات کو آتا اور پیر دباتا اور زار و زار روتا تھا، افسوس کہ یہ جانفزا لمحات ہوا کی طرح گذر گئے۔ بس نام اللہ کا ہے ؎

رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی
رنگ بنفشہ مٹ گیا سنبل تر نہیں رہا

تاریخ کا ورق پھر پلٹتا ہے، تخت ہندوستان پر خلجی خاندان حکمراں ہے اس دور میں میں نے عجیب تماشے دیکھے — خلجی علاء الدین نے اقتدار کی خاطر اپنے چچا اور سسر کو انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ ظلم و شقاوت کی عجیب مثال تھی ؎

بیمار جہاں کو کبھی کہہ نہ سکا قند

میں اس اقتدار کے خواہاں اور ہوس حکومت میں سرگرداں بادشاہ سے نیک توقعات نہ رکھتا تھا لیکن اس خون خرابے کے بعد سب سے پہلے علاء الدین نے ملکی قوانین کو منظم کیا، امن و امان کو بحال کیا چور بازاری کا خاتمہ کیا، اشیاء کے نرخ مقرر کئے، منافع خوری کو قابل تعزیر جرم قرار دیا، علاء الدین کا شمار دیندار و متقی سلاطین میں نہیں کیا جاتا لیکن وہ ایک لائق و کامیاب حکمراں ضرور تھا اس کے زمانہ میں مختلف شعبہائے زندگی میں ترقی ہوئی اور اسی کے دور حکومت میں باکمال علماء و فضلاء بکثرت جمع ہوگئے تھے، لیکن افسوس کہ ۳۰ سال کی مختصر سی مدت میں اس خاندان کا اقبال زوال پذیر ہوگیا۔

اب تغلق خاندان ہندوستان پر حکمراں ہے اس دور حکومت میں ایک مسکین صفت و نیک دل بادشاہ سلطان محمد تغلق ہوا اس دیوانہ کے سر میں یہ سودا سمایا کہ پایۂ تخت دہلی سے بدل کر دولت آباد منتقل کردے لیکن خدا کو میری تنہائی و بے بسی پر رحم آگیا اور دیوانہ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، محمد تغلق کے بعد ایک نوجوان فیروز تغلق تخت و تاج کا وارث ہوا اس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کئے، اسی زمانہ میں دہلی میں ایک بڑے مصلح اور روحانی پیشوا شیخ نظام الدین بدایونیؒ تھے انکی ایک بڑی خانقاہ تھی اور وہ مرجع خلائق تھی مادی حکومت کے زیر سایہ یہ روحانی حکومت کارفرما تھی جس کے سرتاج شیخ نظام الدین تھے۔ خاندان تغلق نے ہندوستان کے نقشہ پر انمٹ یادگاریں چھوڑیں اور رفاہی کاموں میں اس خاندان نے امتیاز پیدا کیا، ۱۲۵ سال تک شان و دبدبہ سے حکومت کرنے کے بعد خدائی فیصلہ سے اس خاندان کو جگہ خالی کرنا پڑی۔

خاندان تغلق کے بعد لودھی خاندان برسر عروج ہوا، اس خاندان میں ایک نامی بادشاہ سکندر لودھی ہوا وہ بڑا لائق اور علم دوست شخص تھا اس کے دور حکومت میں جونپور علم کا شیراز بنا ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں علمی ترقی ہوئی اور جونپور مرجع انام بنا، میں جونپور کے انصاف پسند بادشاہوں اور وہاں کے مشہور زمانہ علماء جیسے قاضی شہاب الدین دولت آبادی، شیخ ابوالفتح بن عبدالمقتدر وغیرہ کے واقعات کیف آگیں انداز میں سنتا اور وہاں کی مسجدوں، مدرسوں کے حالات بڑے انہماک اور شوق سے

کانوں سنتا اور میری خوشی و اہتزاز کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

اسی زمانہ میں احمد آباد کی شہرت بھی نصف النہار پر تھی، علماء، صلحاء، محدثین، مدرسوں کی وجہ سے احمد آباد معروف تو تھا ہی، نوع بہ نوع صنعتوں، باغوں اور دست کاری کے نمونوں سے امتیاز درجہ حاصل کر گیا۔ جب میں وہاں کے انصاف پرور مخلص بادشاہوں محمود شاہ اور مظفر شاہ کے قصے سنتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ دورِ صحابہ عود کر آیا ہے اور شاید تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔

ابراہیم شاہ کے زمانہ میں تیموری خاندان کا مردِ آہن بابر ہندوستان آیا لودھی و بابر کا مقابلہ ہوا۔ لودھی کے پاس ایک لاکھ کی کثیر فوج تھی لیکن وہ آلاتِ حرب اور جنگی تدبیروں سے نابلد تھی۔ بابر کے پاس بارہ ہزار کی مختصر سی فوج لیکن جنگی تدبیروں اور سامانِ حرب سے خوب واقف اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لودھی کو شکست فاش ہوئی اور ایک مرتبہ یہ بات پھر ثابت ہو کر رہی کہ قلت و کثرت اصل چیز نہیں، عزم کی پختگی، عملی اسپرٹ، تحمل کی ارجمندی فتح و کامرانی کی شاہ کلید ہے، اس لودھی کی شکست سے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں، اور بابر اس عظیم الشان سلسلۂ حکومت کا بانی بنا جس کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے اس خاندان کے زندہ و پائندہ نقوش آج بھی قلب ہندوستان پر مرتسم ہیں۔

بابر کے بعد ہمایوں سریر آرائے حکومت ہوا لیکن ابھی ابتدائی دور تھا اسی اثناء میں شیر شاہ سوری نے دھماکہ خیز صورت حال کر دی اور ہمایوں کو ہندوستان سے مار بھگایا ہمایوں ایران چلا گیا شیر شاہ سوری نے خطرہ کی دیوار کو ٹال کر حکومت کی باگوں کو مستحکم کرنا شروع کیا امن و امان بحال کیا تعمیری پروجیکٹ بنائے اور عملی شکل بھی دی، اس نے اپنے دور حکومت میں وسیع و عریض شاہراہ بنگال سے پشاور تک بنوائی یہ اس زمانہ کا حیرت انگیز زمانہ تھا، ۵ سال کے مختصر عرصہ میں شیر شاہ نے وہ کام کر دکھائے جو بادشاہوں کی فوج ظفر موج انجام نہ دے سکی تھی۔

شاہ ایران کی مدد سے ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا اور ہندوستان آ کر اسی کا انتقال ہو گیا، ہمایوں کے بعد اکبر تختِ حکومت پر براجمان ہوا اور غارت گرِ دین و ایمان کا روپ دھار کر سریر آرائے حکومت ہوا اس بت طناز نے دین و اسلام کی بیخ کنی کی ممکنہ کوششیں کیں اور دین کو نئے "دین الٰہی" کے رنگ و روغن میں پیش کرنا چاہا اور اپنے ارد گرد علماء سوء کا حلقہ بنا لیا لیکن دین کا آہنی قلعہ علماء سوء کی حوصلہ شکنیوں اور بے بال و پر دلیلوں اور اکبر کی سوختہ سامانیوں سے منہدم نہ ہو سکا میں اس وقت بہت خوش ہوا جب کہ اس کافر ادا اکبر نے آگرہ کو پایۂ تخت بنایا اور دہلی سے اس کا منھ کالا ہوا۔

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تختِ حکومت پر بیٹھا یہ اپنے باپ سے غنیمت تھا اس کے زمانہ میں اکبر کے دور کی فتنہ سامانیوں نے دم توڑا لیکن بدعات و رسوم کا ایک سیل بے اماں محیط تھا اور بادشاہ وقت بھی ان میں ملوث اسی دوران خدا نے ہندوستان کی قسمت کو جگایا۔ جبینِ ہندوستان کے تابندہ ہیرے مصلح اعظم مجدد وقت شیخ احمد سرہندی "پیدا ہوئے ان کی کوششوں انتھک محنتوں سے خدا نے ہندوستان کے زمین و آسمان بدل دئے رسومات کے خلاف انہوں نے آوازۂ حق بلند کیا، جاہلی چیزوں پر بھرپور وار کئے نعرۂ حق کی پاداش میں انہوں نے سختیاں بے آرامیاں برداشت کیں لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی یہی تو سبب ہے جس کی وجہ سے ان کی کوششوں سے ایک آفاق جگمگا اٹھا۔ ایک دوسری دولت انہی دنوں ہندوستان کو نصیب ہوئی وہ حدیث رسول کے شیدا، محدث اعظم شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی ذات گرامی ہے جنہوں نے خدمت حدیث کے لئے اپنی عمر عزیز صرف کر دی اور اس موضوع پر بے مثال و لاجواب کتابیں لکھیں، ایک تیسری دولت عاشق حدیث علامہ عبد الحق بخاری کی شکل میں ہندوستان کو نصیب ہوئی میں بہت خوش قسمت ہوں کہ ان بزرگان باصفا کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوتا رہا اور اس پر میں جس قدر فخر و ناز کروں کم ہے۔

جہانگیر کے بعد فن تعمیر کا دلدادہ اسکا بیٹا شاہجہاں تخت حکومت پر بیٹھا، ذوق تعمیر اور نفاست ذوق میں مغلیہ سلطنت میں یہ وہ شخص ہے جس نے بے شمار خوبصورت عمارتیں بنوائیں، دہلی کی بے مثال و لاثانی جامع مسجد اسی کی لازوال فنکاری ہے۔ اور لال قلعہ بھی اسی کے نفاست ذوق کا شاہکار اور اسی کی محبت کی امر یادگار "تاج محل" ہے جس کو اس نے اپنی محبوبہ بیوی کی یادگار میں بنوایا۔ تاج محل آج بھی قلب ہند پر ہیرے کی آب و تاب کے چمک رہا ہے اور اس کا دنیا کے عجائبات میں شمار ہے میں لمحہ بھر کے لئے یہاں سے ہٹتا نہیں لیکن جب سے جنت ارضی ہندوستان پر اس کا وجود ہوا ہے سوچتا ہوں کہ پل بھر کے لئے اس خیابانِ محبت کی سیر کر آؤں۔

شاہجہاں کے بعد اس کا چہیتا بیٹا مغلیہ سلطنت کی آبرو، علم و عمل کا پیکر مجسم اورنگ زیب عالمگیر تخت حکومت پر بیٹھے، انہوں نے بغاوتوں پر قابو پا کر حکومت کی باگوں کو مستحکم کیا، حدود مملکت کو وسیع کیں، عوامی فلاحی کاموں کو فروغ دیا، سرکاری خزانہ کو عوامی خزانہ سمجھتے ہوئے عوام پر خرچ کیا اور اپنا پیٹ اپنی کمائی قرآن کی کتابت کر کے بھرتے، عالم خود بھی تھے اور عالموں کی حد درجہ عزت کرتے، انہوں نے فقہ کو مرتب کرانے پر علماء کی ایک جماعت کو مقرر کیا اور کثیر پیسہ خرچ کر کے فقہ اسلامی کا شاہکار "فتاویٰ عالمگیری" مرتب و مدون کرایا، ظلم و جور کے خاتمہ پر توجہ کی، اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں علم و دین کی حکمرانی تھی۔

مسلمانوں کی بڑی حرماں نصیبی یہ رہی کہ اس نیک طینت، عدل پرور دین و سیاست کا سنگم بادشاہ کے بعد کوئی ایسا بادشاہ ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا جو اورنگ زیب کے نقوش میں رنگ بھرتا۔ دین و سیاست بازیچۂ اطفال بن گئی، سلطنت و حکومت ایک کھلونا، صبح و شام بادشاہ بدلنے لگے، اور حکمرانی دھوکہ کی ٹٹی، خطرہ کی گھنٹی ہو گئی، میں ایسے ناخلف کندۂ ناتراش بادشاہوں کے فضول نام گنا کر آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا مسلمانوں کے اس حال زار پر میں خون کے آنسو رویا کیونکہ دین و اخلاق میں وہ انتہائی پستی پر پہونچ گئے تھے برائیوں کے وہ خوگر ہو گئے رقص و سرود کے وہ شیدائی بے حیائیوں کے فدائی بن گئے، گانا بجانا کھلے عام ہونے لگا سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اخلاقی اقدار کو تارِ عنکبوت کی طرح تار تار کر دیا تھا اب معلوم ہوتا کہ نہ یہ مسلمان ہیں نہ ان کا خدا پر ایمان ہے نہ کسی کتاب ہدایت کے ماننے والے ہیں۔ مجھے اس گھٹے ہوئے جاں فزا ماحول میں واذا اردنا ان نہلک قریۃ الخ کی قرآنی عملی تفسیر نظر آئی اور عذاب الٰہی کے وقوع کے اندیشہ سے میں کانپ گیا۔

محمد شاہ کے زمانہ (۱۱۶۱ء) میں جب برائیاں و بدکاریاں انتہائی عروج پر پہونچ گئیں تو نادر شاہ ایران سے بجلی بن کر آیا اس نے وہ خونریزی مچائی کہ الاماں الحفیظ، سڑکوں پر پانی کی طرح خون بہا اور تقریباً ایک لاکھ ہندوستانی موت کے گھاٹ اترے، لیکن اس واقعہ ہائلہ کے بعد بھی ہندوستانیوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگی تو خدا نے مرہٹے اور سکھوں کو ان پر مسلط کر دیا وہ مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے کھانے والے پلیٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں ہر دور قتل و غارت گری ہوتی۔ لوٹ کھسوٹ عام ہو گئی، دیکھتے ہی دیکھتے آباد بستیاں ویران ہو گئیں آبادیاں الّوؤں کا مسکن بن گئے، خوشیوں کے گھر ماتم کدے بن گئے، مسجدیں مسمار کر دی گئیں اور مسلمانوں میں اتنی ہمت و جرأت نہیں رہی کہ وہ قوت و مردانگی سے ان کا مقابلہ کرتے ان میں بزدلی و خوف سرایت انداز ہو گیا۔ خدا نے احمد شاہ ابدالی کو پیدا کیا وہ ہندوستان آیا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے زبردست معرکہ آرائی ہوئی، ہزاروں مرہٹے اس جنگ میں کام آئے اور ان کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ پھر ہندوستان میں مرہٹہ حکومت کا قیام عمل میں نہ آ سکا، اسی زمانہ میں دہلی میں ایک عظیم شخصیت، عبقری شخص شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے انہوں نے دینِ اسلام کی خوب خدمت کی۔ ظالم و جابر حکمرانوں پر بھرپور تنقید کی، علماء سوء کے باطل عقائد پر بھرپور وار کئے، عالموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور دینی علوم و فنون پر بیش قیمت کتابیں لکھیں، پھر شاہ ولی اللہؒ کے خانوادہ نے اس ولی اللّٰہی سلسلہ کو جاری رکھا شیخ عبد العزیز، شیخ رفیع الدین، شیخ عبد القادر، شیخ اسمٰعیل شہیدؒ نے وہ نمایاں خدمات اور بے مثال کارنامے انجام دیے جس پر دنیا حیران ہے اور ہندوستان اس فخر روزگار خاندان پر رشک کرتا ہے اور اربابِ فضل و کمال اس خاندانِ ولی اللّٰہی کی عظمت کے آگے سربسجود ہیں۔

میرے ہمدم و ہمراز! اس طویل سمع خراشی پر مجھے معاف کرنا میں تمہارا ممنون احسان ہوں کہ تم نے میرے درد دل کو غور سے سُنا، کچھ اور صبر کر لو تاکہ میں آتش سوزاں کی حرارت کچھ کم کر سکوں ایک نہایت اہم بات بتانا تو آپ کو بھول ہی رہا تھا۔ سُنئے سولہویں صدی عیسوی سے انگریزوں نے اپنے ناپاک قدم ہندوستان پر جمانا شروع کیے، وہ تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور ایک تجارتی کمپنی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کلکتہ میں قائم کی، در اصل فساد و خرابی کی جڑ یہی تھی، تجارت کی آڑ میں سفید فاموں نے سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی اور مسلمان سادہ دل بادشاہ اس فریب کو نہ سمجھ سکے، چنانچہ انگریزوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" والا اصول اپنایا، سفید فاموں کی قوت روز بروز بڑھتی رہی اور ہندوستانیوں کی بے حسی بڑھتی گئی اور جنوب میں کرناٹک اور مشرق میں کلکتہ ان کے زیر نگیں آ گیا۔ اس خطرہ کو جیالے نوجوان سراج الدولہ والی مرشد آباد نے محسوس کیا اس نے انگریزوں سے مقابلہ کی ٹھانی۔ پلاسی کے میدان میں مقابلہ ہوا لیکن خدا برا کرے اس دغا باز میر جعفر کا جس نے انگریزوں سے ساز باز کر لی

←

اور میر جعفر غداری پر وہ راضی ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سراج الدولہ کو جیتی ہوئی بازی ہارنی پڑی اور سراج الدولہ کو بھی بنگال سے ہاتھ دھونا پڑا اور اس پر بھی انگریزوں کا سکہ رواں ہو گیا، اس کے بعد میر قاسم اور شاہ عالم اور شجاع الدولہ میدان میں آئے بکسر کے میدان میں ۱۷۶۴ء میں معرکہ ہوا، ہندوستانی فوجیں کثرت تعداد میں بڑھی ہوئی تھیں، لیکن وہ آلاتِ حرب اور تدابیرِ جنگ سے عاری تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی یہاں آ کر بھی مات کھا گئے اور انگریز کلکتہ سے دہلی تک حکمرانی کرنے لگے ؎

یہاں آ کے روتا ہے ابرِ نیساں

اس کے بعد پھر غیرت و حمیت کا مجسم، جبینِ ہند کا درِ شہوار، مسلمانانِ ہند کی آبرو سلطان ٹیپو شہیدؒ نے انگریزوں کو للکارا، لیکن یہاں بھی میر صادق نے اپنی ذاتی اغراض کی خاطر اس ملک کی عظمت و قسمت کو انگریزوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیا جس کی وجہ سے سلطان ٹیپو کو خاک وطن کی حفاظت کرتے ہوئے میدان جنگ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا، اگر یہ غداری نہ ہوتی تو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کا خواب بکھر کر رہ جاتا۔

اس جگر خراش صدمہ کے بعد خدا نے ایک اور موقع مرحمت کیا۔ ایک نوجوان کی جماعت اُبھری، اس جماعت کا قائد ایک سید زادہ تھا، بزرگوں کا تربیت یافتہ، عالم باعمل، فہم و فراست، عقل و دانش، خلوص و دیانت میں بے مثال، یہ شخص سید احمد جلد ہی زبان زد خاص و عام ہو گیا، ان کی بزرگی، عظمت، للہیت، خلوص، جذبہ، سوز، غیرت جوش و ولولہ دیکھ کر اس کے ارد گرد پروانہ وار جمع ہوئے وہ شہر شہر بستی بستی اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر گھومے اور اس راہ میں مصائب و آلام سے پنجہ آزمائی کرتے رہے۔ مسلمانوں میں جہاد کا صور، دعوت کی تڑپ، دین کا سوز پھونکتے رہے، انکے ارد گرد فدائیوں کا ایک حلقہ جمع ہو گیا۔ ۱۲۴۰ھ میں ان لوگوں نے سرحد کا رُخ کیا لوگوں نے سید احمدؒ سے بیعت کر لی اور کچھ دنوں کے بعد یہ جانفزا خبر سننے میں آئی کہ سرحد کا ایک حصہ اس جاں نثار ٹولی نے فتح کر لیا اور وہاں خلافت راشدہ کا نقشہ جم گیا لوگ نماز کے عادی بن گئے، زکوٰۃ دینے لگے، نیکی کا رجحان عام ہوا برائیوں سے لوگ اجتناب کرنے لگے، یہ باتیں میں سُنتا لیکن دل ہی دل میں وساوس چٹکیاں لیتے اس لئے کہ مسلمانوں کی بدعہدیاں میں دیکھ چکا تھا بدعہدی، دغا۔ منافقت گویا انکی سرشت بن گئی تھی میں نے کئی نازک موقعوں پر دیکھا کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مسلمانوں کو زوال و انحطاط سے انہی چیزوں نے ہمکنار کیا ہے۔ یہ باتیں اگرچہ تلخ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حقیقت تلخ ہی ہوا کرتی ہے مجھے اس تلخ نوائی کے لیے معاف کرنا ؎

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

آگے وہی ہوا افغانی مسلمانوں نے بدعہدی کا ثبوت دیا اور یوں سید احمد اور ان کے رفقاء نشاۃ ثانیہ میں ناکام ہو گئے۔

۱۸۵۷ء میں مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوئے انہوں نے ظالم انگریز سے اپنا دامن تار تار چھڑانا چاہا۔ ہندوستانیوں نے ایک زبردست بغاوت کی، مگر ہندوستانی یہاں بھی آپسی خلفشار و بدنظمی کی وجہ سے شکست کھا گئے اس بغاوت کے فرو ہو جانے کے بعد انگریزوں نے شدید انتقام لیا، سینکڑوں مسلمانوں کو پھانسی ہوئی، ہزاروں کا مال و اسباب لوٹا گیا اور ان کی عزت سر بازار نیلام کی گئی۔ انہوں نے اپنے جور و ستم کا نشانہ مغلیہ سلطنت کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر کو بھی بنایا ان کو رنگون جلا وطن کر دیا اور ان کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا یوں مسلم حکومت کو گہن لگ گیا، اور ان کا سات سو سالہ ستارۂ اقبال غروب ہو کر رہا، اس واقعۂ ہائلہ سے مسلمانوں کے عزائم پر اوس پڑ گئی زمین ان کے اوپر بار بن گئی ان کا مقدر ملیا میٹ ہو گیا، خانقاہیں تہ زمین ہو گئیں اور مسجدیں مسمار کر دی گئیں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے [illegible] اندر اندر سلگتے رہے اور ہندوستانی جذبۂ انتقام سے جلتے رہے اور سفید فاموں کو مادر وطن سے نکالنے کے منصوبے بناتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء میں زبردست خون خرابے کے بعد اس سرزمین پاک سے انگریزوں کے ناپاک قدم ہٹے اور دام فرنگ سے وہ آزاد ہو گئے اور یہ کسک بُری طرح مجھے گھائل کئے جا رہی ہے۔

ان دل گرفتہ حالات کے باوجود میں مسلمانوں کے تابناک مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ وہ خواب غفلت سے جاگیں گے ضرور! کیونکہ مسلمان ہی افق عالم کے تابندہ ستارے ہیں وہ اگر ایک سمت ڈوبتے ہیں تو دوسری طرف ضرور نکلتے ہیں ؎

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور یہی وہ تابندہ قدم ہے جس کے

غزل

پروفیسر رشید کوثر فاروقی (بھٹکل)

اہلِ جہاں نے جب کوئی چرکا لگا دیا
آیا ترا خیال، مجھے گدگدا دیا

چھیڑی غزل جو اس نے تو پہلے ہنسا دیا
پھر ایسی تان لی کہ رُلا کر سُلا دیا

نظروں کو جب تمیز نہ تھی، حُسن عام تھا
بالغ ہوئی نگاہ تو پردہ گرا دیا

صہبا کبھی چھوئی بھی نہیں اور نشے میں ہوں
کیا جانے کب کسی نے مجھے کیا پلا دیا

ان سے اس التفات کا کیسے گلہ کروں
اب منہ لگا لیا تو نظر سے گرا دیا

کیا کیا ستم نگاہِ توجہ کے بعد ہیں
احسان کر کے قفل زباں پر لگا دیا

حسنِ شباب! تجھ پہ ٹھہرتی نہیں نگاہ
آخر یہ کس نے چاند کو سورج بنا دیا

ہم سے ذرا بلند تھے اوروں کے آشیاں
مارے جلن کے ہم نے گلستاں جلا دیا

آذر کو انتقام کی حاجت نہیں رہی
ہم نے بنا کے قصرِ حرم آپ ڈھا دیا

بندے تو خیر سب ہیں تم اس ناخدا کے ہو
ہم اُس خدا کے جس نے ہمیں ناخدا دیا

وہ ناخدا تھا، لے کے سفینہ جو چل پڑا
اور وہ خدا تھا جس نے کنارے لگا دیا

رکھی گئی جنون پہ بھی تہمتِ شعور
دنیا نے ہر خلوص کو نامِ ریا دیا

ممنون ہوں کہ تم نے مجھے اے [illegible]
شائستۂ سکونِ تمنا بنا دیا

کتنا ستم ظریف ہے جس نے دیا مجھے
منزل رسی کا شوق، مگر نارسا دیا

کر لی تھی جس نے تیرہ شبی سے مفاہمت
خود میں نے وہ چراغِ تنک ضو بجھا دیا

گو ہم کو راس آئی نہ آب و ہوا کہیں
پہنچے جہاں، دیارِ محبت بسا دیا

چھوٹے تمام عمر کے سجدوں سے ایک بار
لے، آج ہم نے تیرے لئے سر کٹا دیا

مانگی ہوس کسی نے تو ہر چیز چھین لی
سب دے دیا جسے دلِ بے مدعا دیا

اخلاص تھا دعا میں، قضا آ کے پھر گئی
اُن کا لکھا ہوا تھا، انہوں نے مٹا دیا

ہر درد ہم سے صلح پہ مائل ہے دوستو
جب سے رواجِ شکوہ و نالہ اٹھا دیا

کوثر کی روح ایک مجاہد کی روح تھی
ماحولِ بے کشاد نے شاعر بنا دیا

پاس نجات کا ابدی و سرمدی پیغام ہے اور آج عالم اسی قیادت کا منتظر ہے۔ آپ میری طرف سے مسلمانوں کو یہ پیغام دے دیجئے:

"مسلمان جب تک متحد نہیں ہوں گے اور وہ دین کی رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑیں گے وہ کامیاب و بامراد نہیں ہو سکتے دین کا دامن تھام کر کامیابی ان کے قدم چومے گی اس کے لئے جہد مسلسل اور عمل پیہم کی ضرورت ہے اور بس! ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد الحسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: [illegible] ندوی

کاتب و تزئین کار: جلال الدین بستوی ندوی

پروفیسر

رشید احمد صدیقی مرحوم

۱۸۹۳ء ـــــ ۱۹۷۷ء

عبدالسمیع صاحب ایم-اے

۱۵/جنوری ۱۹۷۷ء کی شب آئی بعشاء کی نماز پڑھ کر مسجد ندوہ سے گھر آیا ہی تھا کہ شفیق الرحمٰن صاحب ندوی استاذ ندوہ نے آکر خبر دی کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے انتقال فرمایا۔ علی گڑھ سے فون مولانا منظور نعمانی صاحب کے یہاں آیا اور مولانا زکریا صاحب نے فون سے اطلاع دی۔ اس خبر کے سننے کے لئے میں اور میری اہلیہ یعنی پروفیسر مرحوم کی چھوٹی ہمشیرہ تیار نہ تھیں کیونکہ دو تین دن پہلے عزیزی فصیح احمد کا خط مل چکا تھا۔ مرحوم کے کسی قسم کی بیماری اور علالت کی خبر نہ تھی۔ خاندان میں ان کی ایک عظیم شخصیت تھی۔ جن کے علمی پرتو سے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد نے استفادہ کیا تھا۔ ان کا علمی۔ ادبی۔ اخلاقی اور روحانی فیض برابر جاری رہا۔ چھوٹوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ذرا بھی کسی کو تکلیف ہوئی تو مرحوم راحت و آرام کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔ ہر ایک کو خوش و خرم دیکھنا پسند کرتے اور خوش حال زندگی بسر کرنے میں مدد کرتے۔

بے چین قلب نے چاہا کہ جلد سے جلد علی گڑھ پہنچ جاؤں۔ اگلے دن ضروری کام ختم کر کے بعد مغرب مولوی قمر صاحب ندوی کے ہمراہ اسٹیشن پہونچا۔ موصوف ٹکٹ لائے مگر معلوم ہوا کہ دہلی اکسپریس کانپور کے بجائے مراد آباد ہو کر جائے گی۔ سردی تیز پڑ رہی تھی ہمت نہ ہوئی کہ شب میں اس طرح سفر کروں۔ واپس آیا۔ دوسری صبح یعنی ۱۷/جنوری کو قمر صاحب نے مجھے اسٹیشن پہونچایا۔ جھانسی میل سے سفر ہوا۔ ڈھائی گھنٹہ تاخیر سے ٹرین علیگڑھ پہونچی۔ اُترنے میں دشواری ہوئی۔ یہ ڈبہ پلیٹ فارم پر نہ تھا۔ بستر کو نیچے گرا دینا پڑا۔ سوٹ کیس لے کر اُترا۔ پُل کو پار کرنا تھا۔ ٹکٹ دیکر ایک ہی زینہ پر قدم رکھا تھا کہ ایک رکشہ والے نے جھپٹ کر بستر اور بکس میرے ہاتھ سے لے لیا اور سیدھا رکشے پر لا رکھا۔ لکھنؤ کی طرح رکشے والے نے مول تول نہ کی۔ مجھے لے کر ایم۔ایم ہال کی طرف روانہ ہو گیا میاں فصیح کے کوارٹر کے سامنے رُکا۔ شام کا وقت تھا ۵½ بجے تھے۔ بچے باہر کھیل رہے تھے۔ فاروق اور فاران نے دور سے دیکھ لیا ابا ابا کہتے ہوئے رکشے کے پاس آ گئے۔ ان کی آواز نے گھر کے اندر سب کو چونکا دیا۔ عزیزی وصی احمد۔ میاں فصیح میاں شفیع اللہ وغیرہ باہر نکل آئے اور سب نے سلام کا نذرانہ پیش کیا۔ اندر گیا پہلے نماز ادا کی۔ اسی اثناء میں صالحہ نے ناشتہ تیار کر لیا۔ صبح کے ناشتہ کے بعد چائے نصیب ہوئی۔ سفر میں چپقلش ایسی تھی کہ کسی چیز کے کھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

مغرب کا وقت آگیا۔ نماز ادا کی اور پھر قبلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میاں فصیح ساتھ تھے۔ بڑی ہمت کر کے مرحوم کے اہلیہ کے پاس جا بیٹھا جن کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ دل تڑپ گیا۔ یوں فرمایا "آہ! جانے والے نے مجھے کتنی عزت بخشی اور کس معراج زندگی تک پہونچا دیا۔ اب خواب و خیال ہو گیا۔" میرے آنسو نکل پڑے۔ ہر آہ پر دل تڑپ جاتا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ چند خواتین ارد گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے بچے صالحہ اور فہمیدہ بھی آگئیں۔ خاموشی طاری تھی کہ ڈاکٹر انیس انصاری صاحب مع اہلیہ کے جو خود بھی ڈاکٹر ہیں آ گئے۔ میں نے کسی کو اس طرح بلک کر روتے نہیں دیکھا جیسا کہ ڈاکٹر موصوف نے بلک کر سسکیاں لیں۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ بیگم خسرو صاحبہ بھی تشریف لے آئیں۔ گلے مل کر آنسوؤں سے اظہار غم کیا اور قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ یونیورسٹی میں جو وہ خود خدمت انجام دے رہی تھیں اس کا ذکر آیا۔ شیر خوار بچوں سے لے کر چار پانچ سال کے بچے کے لئے پرورش گاہ کھول رکھا ہے جو موصوفہ کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ اسی طرح کچھ اور خواتین آتی رہیں اور مرحوم کی یاد تازہ کر کے آنسو گراتی رہیں کمرہ غمکدہ بنا رہا۔ مرحوم کی بڑی صاحبزادی سلمیٰ بی نے جو بمبئی سے آگئی تھیں سب کا خیر مقدم کیا۔ مزاج پرسی کی۔ انمیں کوٹ کوٹ کر انکسار بھرا ہوا تھا ساتھ ہی پیکر اخلاق بنی رہیں۔ آنے والوں کا خیر مقدم کرنا اور درد بھرے الفاظ سے رخصت کرنے کا کام انجام دیتی رہیں۔ اسی طرح شب کا اچھا خاصہ وقت گذر گیا۔ ۹½ بجے میز پر کھانا لگا۔ موجودہ خواتین اور مردوں نے کھانا کھایا۔ اس وقت میاں کمال تنہا مردوں میں میزبان بنے جو مرحوم کی روایت قائم کئے ہوئے ہیں۔ چمن۔ لان۔ گل و بوٹے گلاب کے پھول شہادت دے رہے ہیں کہ باغ و چمن کی رکھ رکھاؤ میں سر مو فرق نہیں آیا ہے۔ چمن کی شادابی اور کیاریوں کے پھول اور پودے سرسبز اور شاداب ہیں۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم روپوش ہیں سب کو ان کا انتظار ہے میاں کمال میں وہی خوش مذاقی ہے جو کہ مرحوم میں تھی۔ صاف ستھری کوٹھی چھوڑ کر گئے۔ سب کے سب مرحوم کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ میری نظر بار بار اس کرسی کی طرف جو بڑے تخت سے ملی تھی اٹھتی۔ تصویریں پروفیسر مرحوم بیٹھے نظر آتے۔ آہ تصور نے دھوکہ دیا۔

وہ نہ تھے۔ اگلی صبح یعنی ۱۸/جنوری کو قبلہ نیاز احمد صاحب عزیزی شکیل احمد کے ہمراہ علی گڑھ پہنچ گئے۔ مجھے اطلاع ملی کوٹھی پر گیا۔ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ دھوپ میں ایک طرف بیگم مرحوم تصویر غم بنی بیٹھی تھیں۔ داہنے جانب سلمیٰ بی تھیں۔ سامنے نیاز احمد صاحب قبلہ اور میں بیٹھا۔ نیاز احمد صاحب کے بڑے بھائی کی حیثیت سے ان پر شفقتیں جاری رہیں اور ہمیشہ موصوف کے سادگی سے بیحد متاثر رہے۔ نیاز صاحب قبلہ کی سادہ زندگی اور پابند عبادت کو ہمیشہ اچھی نظر سے دیکھا اور خطوط میں ذکر فرمایا کرتے تھے۔

فصیح میاں نے ماموں میاں کے آخری دن اور آخری لمحات کی کیفیات کو دلسوزی سے بیان کیا۔ کہا کہ ۱۴/جنوری کی شام کی حاضری میں سب کی پرسش اور خیریت کا دریافت کرنا۔ زندگی کے نشیب و فراز۔ علمی اور وارثین کے فرائض پر روشنی ڈالی، بدگمانی اور تلخ کلامی سے بچنے کی تلقین کی۔ ذہن و حافظہ پر کمزوری نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ جسمانی قوت جواب دے رہی تھی، اپنے ہاتھ اور پیروں پر بھروسہ نہ رہ گیا تھا۔ رات کے آخری حصہ میں تکلیف بڑھ گئی سینہ دباؤ اور کرب کا مرکز بن گیا۔ کراہٹ منہ سے نکلتی رہی۔ میاں کمال اور بیگم خدمت میں اور کوشش میں لگی رہیں کہ تکلیف میں افاقہ ہو جائے۔ بقول

مرض بڑھتا ہی گیا جیوں جیوں دوا کی

صبح سے دوپہر آئی میڈیکل کالج کے متعدد ڈاکٹر تشخیص مرض اور علاج مرض میں لگے رہے۔ کمرہ میں فصیح۔ صالحہ۔ کمال میاں سرہانے اور پیتانے بیٹھے رہے۔ بیگم صاحب کچھ ساگودانہ لائیں۔ اصرار سے چمچہ چمچہ کر کے کھلایا۔ ہوش و حواس بالکل ٹھیک رہے۔ بیچینی اور کراہٹ جاری رہی۔ جب بیقراری زیادہ بڑھی تو گود میں لینے کے لئے فرمایا۔ فصیح اور کمال میاں نے مدد کی۔ اب سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ بھانجوں سے فرمایا کہ مجھے اس طرح کر دو جیسا کہ نماز میں سجدہ کرتے ہیں اس کی تکمیل کی گئی۔ مگر بیقراری ایسی تھی کہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہ رہ سکے۔ داہنے کروٹ کر دینے کو فرمایا۔ غالباً خواہش یہ تھی کہ اللہ کے سامنے سربسجود ہو کر اپنی آخری سانس لے کر جاں سپاری کر کے اللہ کے پیارے بن جائیں۔ منہ سے "اللہ فضل" نکلا۔ لیٹے ہوئے تھے کہ کراہٹ بند ہو گئی۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ فصیح وحشت زدہ ہو گئے۔ ڈاکٹر عارف علاج کے فکر میں میڈیکل کالج جا چکے تھے۔ سوا تین کا وقت تھا ڈاکٹر مسعود حسن خاں صاحب آ گئے۔ آنکھیں دیکھیں جسم کا جائزہ لیا اب کوئی حرکت باقی نہ رہی تھی۔

جان باقی نہ رہی یعنی نکل چکی تھی۔ سب پر غم کا بادل چھا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شام ہو گئی۔ سردی شباب پر تھی۔ فصیح، نعیم، جاوید کمرہ کے اندر میت کے ارد گرد رہے۔ میاں فصیح بیقراری میں کبھی کمرہ میں کبھی باہر ٹہلتے رہے۔ کبھی چادر ہٹا کر ماموں کے چہرہ پر نظر ڈالتے۔ میاں کمال کمرہ میں بند ہو کر نڈھال پڑے رہے۔ بیگم غم سے نڈھال نیم بیہوشی کے عالم میں اپنے کمرہ میں تھیں۔ ان کی غمگساری میں پروفیسر ابرار مصطفیٰ کی بیگم صالحہ اور فہمیدہ نے قریب ہی تخت پر رات بسر کی۔ ۱۶/جنوری کی صبح آئی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر سید وحید الحسن صاحب آخری وقت تک معالج رہے اور غسل میت دینے کے فرائض انجام دئے۔ تجہیز و تکفین کے بعد کچھ لوگ کے لئے جنازہ سبزہ زار پر رکھا گیا۔ بیگم نے گرتے پڑتے دھڑکتے دل اور آنسو سے بھری آنکھوں سے جنازہ دیکھا۔

غسل دینے کے وقت دیکھا گیا کہ انگلیاں اس طرح جھکی ہوئی ہیں گویا تحریر کے لئے بیقرار ہیں۔

یونیورسٹی کے سبھی کارکن جنازہ کے ساتھ تھے۔ کس کا جنازہ لے جا رہے تھے؟ ایسی ہستی کا جنازہ تھا جس نے جینا مرنا سبھی باتیں اپنی محبوب یونیورسٹی کے لئے وقف کر دی۔ جنازہ یونیورسٹی کے قبرستان کی طرف چلا۔ نماز جنازہ پڑھی گئی، اس فرض کفایہ میں پابند نماز اور تارک نماز سبھی شریک ہوئے۔ کیا منظر تھا! بڑے بڑے عابد اور زاہد اس پر رشک کرتے۔ آخر میت قبر میں اتار دی گئی۔ تدفین کے بعد دعائے مغفرت کی گئی۔ سب کے چہرے شہادت دے رہے تھے کہ اللہ کا ایک مقبول بندہ سپرد خاک ہوا۔

۱۸/جنوری کو قبلہ نیاز احمد صاحب کو لیکر فصیح میاں کی رہنمائی میں قبرستان کی طرف چلا۔ مرحوم کی خصوصیات اور خوبیوں کا ذکر ہوتا رہا۔ سامنے داخلے کا پھاٹک آیا۔ ہم لوگ داخل ہوئے۔ پختہ و خام قبریں یاد دلاتی ہیں کہ آخری منزل یہی ہے۔ داہنے طرف مڑ کر کچھ دور گیا تھا کہ ایک تازہ قبر نظر آئی۔ دو اشخاص اس کے قریب ملے قبر پر دیکھا کہ گلاب کے پھولوں کی بارش تھی۔ مرحوم کو گلاب کے پھول سے جو عشق تھا اس کی یاد تازہ ہو گئی۔ قبر کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ فاتحہ پڑھا اللہ تعالیٰ سے دعا کی "اے حیات و ممات کے مالک تیرا یہ نیک بندہ تیرے پاس پہنچ گیا ہے توحید کا پرستار رہا۔ تجھ پر ہمیشہ بھروسہ کرنے کی تلقین کی۔ خاندان والوں سے محبت کی۔ تو اب اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے۔"

واپس آنے پر سلمیٰ بی نے کھانا کھلایا فرصت پا کر چار دن قیام پر واپس آیا لکھنؤ واپس ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ پاکستان سے میاں احسان رشید (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) کا آنا زیادہ یقینی ہوا مگر دو روز تک فون یا تار سے کوئی خبر نہ ملی۔ خدا خدا کر کے مہر سکوت ٹوٹی۔ تار ملا کہ ۲۶/جنوری کو ۷ بجے شام کو کراچی سے دہلی پہونچیں گے۔ کچھ ہی دیر بعد یہ خبر آئی کہ میاں جلال اور عذرا (مرحوم کی چھوٹی بیٹی) قاہرہ (مصر) سے کراچی ہوتے ہوئے اسی جہاز میں میاں رشید کے ہمراہ دہلی پہونچیں گے۔

۲۱/کو جمعہ کا دن تھا۔ یونیورسٹی کے جامع مسجد میں نماز ادا کی۔ مسجد نمازی طلبہ سے بھر گئی۔ سیاہ شیروانیوں میں ملبوس افراد نظر آئے۔ یونیورسٹی کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم رنگی اور اخوت کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ امسال سے اس لباس کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مسجد کے جانے اور آنے مولانا سید ابوالحسن علی (علی میاں) کے نام کے اشتہارات پھاٹکوں اور دیواروں پر چسپاں نظر آئے۔ اسلامی مطالعات کے شعبہ کی جانب سے مدعو تھے۔ "اسلام جدید بدلتی ہوئی دنیا میں" موضوع پر ایک سیمینار کی افتتاح کے لئے ۲۲/کو کینیڈی ہال میں خطاب کرنا تھا صبح متعدد ندوی حضرات کے ساتھ پروفیسر ابرار مصطفیٰ کے بنگلہ پر قیام فرمایا۔ کچھ دیر کے لئے پروفیسر مرحوم کی کوٹھی تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ میاں کمال اور قبلہ نیاز احمد صاحب موجود تھے۔ میں دس بجے کوٹھی پر پہنچا قبلہ نیاز صاحب کو لے کر کینیڈی ہال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی اندر داخل نہیں ہوا تھا کہ مولانا معین اللہ صاحب ندوی مدیر تعمیر حیات مولانا برہان الدین صاحب استاذ ندوہ۔ عزیزی سلمان حسنی متعلم ندوہ وغیرہ نے تیز رفتاری سے چل کر بڑے تپاک سے گلے۔ ان عزیزوں کے ساتھ ہال کے اندر پہلی بار داخل ہوا اور اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ایک صاحب مجھے اسٹیج پر جانے کو کہا۔ جہاں خصوصی علی میاں پروفیسر انوار الحق حقی صاحب وائس چانسلر اے۔ ایم خسرو صاحب یلیب جی اور اقبال صاحب انصاری ندوی صاحب وسط میں بیٹھے۔ داہنے اور بائیں جانب ڈیلیگیٹ حضرات تھے خسرو صاحب نے صدارت کی۔ حقی صاحب نے کنوینر کی حیثیت سے جلسہ کے غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ خسرو صاحب نے جدید دنیا میں نئے مسائل کی روشنی میں اسلامی اصول میں تغیر پر زور دیا۔ آخر میں علی میاں کی تقریر ایک گھنٹہ دس منٹ تک جاری رہی۔ تقریر کا لب لباب یہ ہے:

مذہب اسلام ایک روشن آفتاب ہے، ایک بہتا رواں دریا ہے، اس کا فیض جاری ہے، البتہ تعیش اور اقتدار کی بھوکی دنیا اصلاح چاہتی ہے۔ کوئی روشنی سے نہیں کہتا کہ تو بدل جائے ہاں اس سے استفادہ ضروری ہے۔

تقریر کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد علی میاں سے ملا اور معانقہ کیا۔ پھر اقبال انصاری ندوی، بشیر الحق صاحب ندوی اور فضل الرحمٰن صاحبان سے ملاقات ہوئی بڑی عزت سے پیش آئے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب ندوی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ گھر پر تشریف لائے، بہت ہی محبت اور احترام سے ملے۔ دوسرے دن موسم بہت خراب ہو گیا۔ بارش اور سرد ہوا کے باعث سیمینار میں شرکت نہ ہو سکا۔ علی گڑھ کے اس آخری قیام میں زیادہ وقت پروفیسر مرحوم کی کوٹھی پر گذرتا۔ وہیں آنے والے حضرات سے ملاقات ہوتی۔ مثلاً آل احمد سرور صاحب، جناب عبدالرحمٰن خاں شیروانی صاحب وغیرہ آخر ۲۶/کو دوپہر کے بعد میاں کمال اور پروفیسر ابرار مصطفیٰ صاحب بذریعہ ٹیکسی دہلی ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وقت پر پالم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ احسان رشید، جلال میاں جو قاہرہ میں پاکستانی ڈپلومیٹک کور سے وابستہ ہیں عذرا بی کے ساتھ ہوائی جہاز سے اُترے اور دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہر کر تازہ دم ہو کر ٹیکسی پر بیٹھے اور ۱۲ بجے شب میں علی گڑھ پہنچے اور آبائی مکان میں داخل ہوئے جس پر سکون کا عالم طاری تھا، غم کدہ بنا ہوا تھا۔ صرف ماں کی ہستی اور ہمشیر سلمیٰ بی منتظر آنکھوں سے خیر مقدم کرنے کے لئے جاگ رہی تھیں۔ بے تاب گلے لگیں، قلب بے چین تھا۔ آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ میاں کمال نے سب کے لئے علیحدہ کمرے متعین کر دئے تھے۔ سفر کی تکان سے نیز غم سے نڈھال ہو کر اپنے اپنے بستروں پر تین بجے جا لیٹے۔

حسب معمول دس اور گیارہ کے کوٹھی پر گیا۔ احسان رشید۔ عذرا اور جلال میاں کو دیکھے ہوئے ۳۰ سال سے زیادہ گذر چکے تھے۔ احسان میاں کو ایک سروجیہ شخصیت پایا۔ جلال میاں کی شکل و صورت نے اپنی عمر کو دھوکا دے رکھا تھا پنجاہ سالہ صرف بتیس سالہ نوجوان نظر آیا۔ اللہ عمر میں برکت دے۔ خوش وضع خوش مزاج اور خوش کلام پایا۔

نیرنگیٔ زمانہ نے کروٹ بدلی اللہ نے جلال اور عذرا کی زندگی کا وہ باب کھولا جو پُرمسرت بھی ہے اور پُرسکون بھی۔ پروفیسر مرحوم سے میری باشعور وابستگی ۱۹۱۵ء سے شروع ہوئی۔ اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ میرے والد بزرگوار ریلوے میں ملازم تھے اور اٹاوہ میں تعینات تھے۔ والدہ صاحبہ کے ایماء پر نانا صاحب دو سال قبل اپنے ہمراہ تعلیم کی خاطر مالوہ لے گئے تھے۔ وہاں سے بلالیا گیا تھا۔ اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں داخلہ کی خاطر گھر پر ایک ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے۔ سارا دن یہی معمول تھا۔

ایک دن دیکھا کہ ایک خوبرو نوجوان۔ خوش پوشاک۔ انتہائی مہذب اور خوش اخلاق۔ انتہائی مہذب اور خوش اخلاق گھر میں مقیم ہے۔ رشتہ معلوم ہوا۔ ہم لوگ گرویدہ ہو گئے۔ مرحوم کی بے پایاں محبت کا احساس ہوا۔ قبلہ رشید صاحب میں آثار قدیمہ کے دیکھنے کا شوق تھا۔ اٹاوہ میں جمنا کی طرف کچھ عمارتیں ہیں۔ ایک دن وہاں جانے کا پروگرام بنا۔ ہم چھوٹوں نے بھی ساتھ جانے کا شوق ظاہر کیا۔ مزاحیہ انداز میں فرمایا کہ صرف ایک کو لے چلوں گا۔ اور قرعہ اندازی کی۔ میرا نام نکلا۔ چھوٹے بھائی نے رونا شروع کر دیا۔ آخر دونوں کو لے کر گھومنے اور آثار دیکھنے نکلے۔

کچھ بارہ دری سی عمارت میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ دیواروں کا زیادہ حصہ ناموں سے پٹا پڑا ہے۔ مرحوم نے بھی کوشش کی کہ اونچی سی اونچی جگہ پر اپنا نام لکھیں اور لکھ ڈالا۔ واپس ہوئے مرحوم کی ذہانت اور علی گڑھ سے وابستگی کا سکہ ہم لوگوں پر جم گیا۔

میرے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ میری نانہال اور مرحوم کا آبائی مکان ایک ہی قصبہ میں واقع تھے۔ ۱۹۱۶ء میں اٹاوہ سے مڑیاہو چلا آیا۔ مرحوم کے بڑے بھائی عبدالصمد صاحب قبلہ مرحوم کے سکر یٹری شپ میں ایک پبلک اسکول قائم تھا۔ اس میں ۱۹۱۸ء کے آغاز تک تعلیم پائی۔

جب بھی پروفیسر مرحوم آتے ہمارے لئے معلمی کا کام انجام دیتے، کتب بینی کے ایسے عادی تھے کہ نصف شب گذار دیتے، والدہ صاحب آخر فرماتے "رشو اب سوجاؤ"۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک جب تعطیلات ہوتیں علی گڑھ سے گھر تشریف لاتے۔ ہمارے لئے معلمی کے فرائض انجام دیتے۔ صبح کے وقت تحصیل خانہ اور اسپتال کے افراد کے تو خیر لڑکے جمع ہو جاتے۔ اردو کی عبارت بول دی جاتی۔ ہم سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کو کہا جاتا۔ مقابلہ رہتا۔ جس کی عبارت صحیح ہوتی اس کو بڑی داد ملتی۔ بڑے بوڑھے بھی آبیٹھتے اور فرداً فرداً جائزہ لیتے اور ہمت افزائی کرتے۔ سید بھائی اب تک یاد ہیں۔ تحصیلدار صاحب کے صاحبزادہ تھے۔ ... میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے عربی شعبہ میں پروفیسر ہوئے۔ اب مرحوم ہیں۔ اللہ انھیں بخشے۔ ہم سب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے منت کش ہیں جنھوں نے ہماری انگریزی کی تحریر درست کی۔ آجتک میں انگریزی کا استاد بنا رہا۔

اسی زمانہ میں مرحوم کے والد صاحب ہم لوگوں کو اُردو کا املا لکھایا کرتے تھے پروفیسر مرحوم علی گڑھ سے آتے صبح کا وقت تھا۔ ہم لوگوں میں دلچسپی لی اور زبان اردو کی عبارت لکھائی۔ جس کا صحیح ہوگا اُسے انعام دینے کا وعدہ فرمایا۔ جب جانچ ہوئی تو میری ایک غلطی نکلی۔ درس تدریس کا یہ کام مرحوم کے اندر فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔

میرے ایس۔ ایل۔ سی (S.L.C.) کرنے تک یہ دور یادگار رہا۔ باہر کی بیٹھک میں بزرگوں اور تعلیمیافتوں کا اجتماع۔ مختلف اضلاع میں قصبہ کے جو نوجوان تعلیم پارہے تھے جمع ہو جاتے۔ مرحوم کی آمد اور دلچسپی ہم لوگوں کے لئے بڑی کشش رکھتی۔ ہم لوگ ان کی علمی بلندی سے مرعوب تھے تو دوسری صفت اور بھی پرکشش تھی۔ ہم لوگ شام کے وقت عبدالصمد صاحب قبلہ کی سرکردگی میں فٹبال کے میدان میں کھیلا کرتے تھے۔ جب مرحوم کی آمد ہوتی تو فیلڈ کی قسمت کھل جاتی۔ ایسی شخصیتیں ہمارے ساتھ فیلڈ میں کھیلتیں۔ مثلاً عبدالصمد صاحب قبلہ، مرحوم رشید احمد صدیقی صاحب اور قبلہ نیاز احمد صاحب اور بھی ممتاز حضرات شرکت کرتے۔ پروفیسر مرحوم جب تک رہتے فیلڈ ٹورنامنٹ کی شکل اختیار کر لیتی اور دھوم مچی رہتی ہم لوگوں کے ٹیم میں ایک بلندی آجاتی۔ مجھے کھیل میں بھی ایسی ٹریننگ دی کہ ۱۹۲۲ء تک اپنے اسکول کے ٹیم کا کیپٹن رہا۔ دوسری طرف ٹینس فیلڈ بھی درست ہو جاتی اور کھیل کا ایسا سماں بندھتا کہ قصبہ کے بڑے حضرات حصہ لیتے۔ سب رجسٹرار صاحب کی رہائش گاہ اور تحصیل کی عمارت کے درمیان یہ فیلڈ واقع تھی۔ ایسے موقع پر ازسرنو تیار ہوتی اور ٹینس کا کھیل ایسا ہوتا کہ بڑے بڑے کلبوں میں نہیں پایا جاتا۔ مرحوم جب کھیلتے تھے تو ایک باوقار، ماہر کھیل نظر آتے۔ تحصیلدار صاحب، نائب تحصیلدار صاحب، سب رجسٹرار صاحب تماش بین ہوتے۔ کھیل کے بعد خراج تحسین پیش کرتے۔ چند برسوں تک شاندار کھیل ہوتے رہے۔ فٹ بال کے ہوکر آرا کھیل میں میں ضرور شریک ہوتا تھا لیکن ٹینس میرے بس کی چیز نہ تھی۔ نہ کھیلتا اور نہ ہمت ہوتی غرض کہ پروفیسر مرحوم کی دلجوئی اور ہمت افزائی کھیل کے میدان میں ہوتی رہتی۔ پھر وہ زمانہ اور کھیل کے مواقع نصیب نہ ہوئے۔

میرے اندر تحصیل علم کا شوق اور جذبہ پروفیسر مرحوم نے پیدا کیا جس کے پروان چڑھانے میں اور برگ و بار لانے میں مرحوم کے بڑے بھائی قبلہ عبدالصمد صاحب کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اللہ دونوں حضرات کو آخرت میں بلندیاں نصیب فرمائے۔ آمین

پروفیسر مرحوم خاندان کے ہر فرد سے الفت رکھتے اور چاہتے کہ لڑکے اور لڑکیاں سب تعلیمیافتہ بن جائیں۔ دو چھوٹی بہنوں کی تعلیم کی طرف بیحد تاکید رہتی والد صاحب کو اکثر اسکی طرف توجہ دلاتے رہتے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء سے یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ جانا ہوا۔ اس وقت انگلش ہاؤس کے نگراں تھے۔ رہائش، خورد نوش، تہذیب سب میں انگریزوں کی نقالی ہوتی۔ مرحوم کے رفیق اور ساتھی جناب یسین خانصاحب (ایڈوکیٹ جونپور) اسوقت فورتھ ایئر میں تھے۔ جونپور پارٹی کے سربراہ تھے۔ میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے اور بیحد خاطر مدارات کی۔

۳۰-۱۹۲۹ء کا زمانہ بیحد پریشان کن تھا۔ مرحوم درد گردہ میں اکثر مبتلا ہو جاتے اس نے اب ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ آپریشن کرانے پر تیار ہوگئے۔ بیوی بچوں کو بھائی شبیر احمد صاحب کے یہاں بھیجدیا اور خود میڈیکل کالج میں پرائیوٹ وارڈ لیکر داخل ہوگئے۔ ڈاکٹر بھاٹیہ معالج رہے۔ وہ مہیب دن آیا جب کہ آپریشن ہوا۔ ایک گردہ جو خراب ہو گیا تھا نکال دیا گیا۔ ایک معمولی ہمت کے شخص میں اس کی جرأت نہ ہوتی۔ مرحوم کی عالی ہمتی جس آزمائی۔ اللہ پر بھروسہ۔ زبان پر شکر گذاری فضل باری پر یقین تھا۔ یہ سب باتیں ایک مرد مومن ہونے کی غمازی کرتیں۔ اللہ نے شفا دی۔ اور پروفیسری کے فرائض انجام دینے لگے۔

میں نے ۱۹۲۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت انگریزی استاد کے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں پروفیسر مرحوم کو لکھا کہ میں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مع بیوی بچوں اور میاں کمال کے سولن (Solan) (شملہ) میں تعطیل گذار رہے تھے جب داخلہ کا وقت آیا تو میری خاطر سب کو چھوڑ کر علی گڑھ تشریف لائے سیدین صاحب (پرنسپل ٹریننگ) کو لکھا۔ انٹرویو ہوا۔ بی۔ ٹی میں داخلہ مل گیا۔ مجھ پر فصلی بخار کا حملہ ہوا۔ دل و جان سے میرے علاج کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند دن کے لئے لکھنؤ واپس آگیا۔ جب واپس ہوا تو سب لوگ شملہ سے واپس آچکے تھے۔ میرے لئے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کیا۔ اپنے ہاتھ سے ساری چیزوں کو درست کر کے میرے آرام کے لئے فراہم کیا۔ مکان کا یہ مردانہ حصہ تھا جو یونیورسٹی کے باب اسحٰق کے قریب تھا۔ پروفیسر مرحوم کے یہاں باہر کے کروں میں قیام فرماتے۔ کبھی بار ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ ثم صدر مملکت ہند) تشریف لائے اور قیام فرمایا۔ کبھی کبھی ٹریننگ کالج کی لائبریری سے کتابیں منگواتے اور واپس کرتے تھے۔ اُسی وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جگر مرادآبادی بھی اکیلے اور کبھی دو چار پرستاروں کے ہمراہ آئے۔ آخر ٹریننگ کر کے واپس ندوہ ہوا۔ اسی دوران رہائش میں عزیزی احسان رشید مجھ سے بے حد مانوس رہے اسوقت چھٹے درجہ میں منٹو سرکل میں پڑھتے تھے۔ اب اعلیٰ شخصیت کے مالک ہیں۔ پروفیسر مرحوم کی بیگم اپنے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلاتیں۔ اور رمضان شریف کے زمانہ میں سحری کا خاص انتظام رکھتیں۔ بی۔ ٹی کی ٹریننگ سے ملازمت میں استحکام پیدا ہوا۔ ۱۲-۱۳ برس بعد جب یوپی میں ہائر سکنڈری اسکول قائم ہوئے تو ممتاز ہائر سکنڈری اسکول کی پرنسپلی ملی۔ ۱۷ برس ۳ ماہ ملازمت کر کے ریٹائر ہو گیا۔ مگر ندوہ سے اور ندوہ کے ماحول سے کبھی جدا نہ ہوا۔ اب بھی ۷۲ سال کی عمر میں ندوہ کی توجہ اور خدمت کی سعادت حاصل ہے۔ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۷۶ء کے درمیان کئی بار جانے کا اتفاق ہوا نئی کوٹھی میں رہائش تھی۔ ہمیشہ بلند اور ستھرا مذاق پایا۔ اخلاق کو "از سنبل و ریحاں خوشتر" دیکھا۔ زیادہ وقت چمن بندی اور گلابوں کے رکھ رکھاؤ میں لگاتے۔

اُردو کے چیرمینی سے ریٹائر ہو کر بس دو ہی کام تھے۔ مضامین کا لکھنا اور سبزہ و گل کی دیکھ ریکھ۔ رہبان نہ تھے، مگر رہبانی زندگی ضرور تھی۔ ایک کمرہ سونے، بیٹھنے اور تنہائی میں گذارنے کے لئے مخصوص تھا۔ کوئی سجاوٹ نہ تھی فرش پر کوئی غالیچہ نہ تھا، نہ ریشمی پھول بوٹوں کے پردے آویزاں تھے۔ ایک لکڑی کی الماری تھی شیشہ دار جس پر معمولی کپڑا پڑا رہتا۔ پلنگ کے سرہانے ایکطرف ایک چھوٹی میز تھی جس پر کچھ کاغذ۔ دوات اور قلم اور کوئی مطالعہ کی کتاب یا رسالہ ہوتا۔ دو کرسیاں آمنے سامنے رکھی ہوتیں۔ آرام کرسی جس پر گدا لگا ہوتا خود بیٹھتے دوسری خالی رہتی کبھی میاں فصیح یا کوئی اور جس کو بہت قربت ہوتی بیٹھ جاتا۔ باہر برآمدہ میں ایک کرسی اور ایک چھوٹی سی کھٹیا ہوتی اسی پر پیر کے پنجے رکھ کر لکھنے میں مشغول رہتے۔ اسی

طرح دہلی برآمدہ میں تخت سے ملحق کرسی کبھی ہوتی اس پر آکر بیٹھتے۔ مراسلوں کا جواب اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے۔ لباس فاخرہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ سادگی عزا صحت کے اعتبار سے مختصر ہوتی۔ شہرت اور مجمع سے دور رہتے اعزازی ڈگریاں ملیں۔ مگر عام مجمع میں لینے نہ گئے۔ اسٹیج پر جاکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی نہ لی۔

قدرت کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ مرحوم خانہ نشین بلکہ گوشہ نشین تھے مگر اپنے فضل و کمال کے باعث ہند کے برصغیر میں معروف تھے۔ قدردان ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے تلامیذ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ جن کے دلوں میں ان کی عظمت، احترام اور محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

۲۸ جنوری کو برآمدہ میں بیٹھا ہوا تھا دیکھا کہ میاں احسان رشید، جلال میاں اور عذرا تعزیتی خطوط اور تاروں پر نظر ڈال رہے ہیں۔ میری نظر اس تار پر پڑی جسے صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد اور عابدہ خاتون نے بیگم رشید کے نام بھیجا تھا۔ یہ سلسلہ ایک گھنٹہ سے زیادہ چلتا رہا۔ اس سانحۂ ارتحال سے کتنے لوگ متاثر ہوئے شمار کرنا مشکل ہے۔

مرحوم کی زندگی پُرآشوب نہ تھی مگر آشوب زمانہ سے خوب واقف تھے۔ اگر انکساری تھی تو عزت نفس کا بھی بیحد پاس و لحاظ تھا۔ زیادہ ملنے جلنے سے احتراز کرتے۔ شانِ امارت تو تھی ہی نہیں۔ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے۔ تملق، خوشامد اور مال و زر کی ذرا بھی خواہش نہ رکھتے قانع اور اللہ پر شاکر رہتے۔ خیالات بلند تھے۔ تحریروں میں اسلامی روح بھری ہوئی مشرقی تہذیب و تمدن ان کا شعار تھا۔ اس کے دلدادہ تھے۔ علی گڑھ کے اغراض و مقاصد رگ و پے میں جاری و ساری تھے۔ وہ اپنی ہستی کو خوب پہچانتے تھے۔ اقبال نے ایسی ہی ہستی کے لئے کہا ہے ؎

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

خدا کے ترجمانی کا کام ساری تحریروں میں انجام دیتے رہے ہیں۔ اقبال نے اس کے لئے شعر سے کام لیا اور پروفیسر مرحوم نے نثر سے۔ مرحوم کی تحریروں اور تصانیف سے اس پر روشنی پڑتی ہے موقع ملا تو اس پہلو کو اور اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔

مرحوم کی سیرت، زندگی اور خیالات کی جھلکیاں ان کے ان خطوط سے ملتی ہیں جن کو عزیزوں اور چھوٹوں کو تحریر فرماتے تھے۔ یہاں دو ایک کو نقل کرتا ہوں جسے اپنے بھانجے ڈاکٹر احمد مطیع کو لکھا تھا۔ زمبر ... دسمبر

"ڈیر مطیع۔ دعا

ڈاکٹر ابرار مصطفےٰ صاحب آگئے ... تمہارا بھیجا ہوا فرشی جوتا لائے جو کتنا خوبصورت آرام دہ ہے اتنا ہی قیمتی ہوگا ...... تم جانتے ہو میں کتنا چلتا پھرتا ہوں۔ دن رات میں مشکل سے سو دو سو قدم۔ ایسا عمدہ تحفہ ایسے بوڑھے اور از کار رفتہ شخص کے لئے موزوں نہیں گذشتہ ۲۰ سال سے میں نے اپنے آرام یا نمائش کے لئے کوئی چیز نہیں خریدی کو کو اور احسان کی چیزوں سے کام چلتا ہے۔ اس سے بہت خوش رہتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے اور اس کا ذکر بار بار تمھیں سے بھی کر دیتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نیا کپڑا یعنی کفن بھی مُردوں کے لئے موزوں نہیں۔ نیا کپڑا زندوں کے لئے ہوتا ہے کفن کے لئے پرانی دھلی چادر یا چادریں کافی ہیں۔ کاش تم نے اس قیمتی جوتے کے بجائے کوئی اور چیز بھیجی ہوتی جو باغ۔ باورچی خانہ، کھانے کے کمرہ یا ڈرائنگ روم کے لئے ہوتی اس سے سب فائدہ، آرام اور لطف اٹھاتے ...... عنقریب جو تقریب ہونے والی ہے اس کے لئے حسب معمول تم جو بی اور فصیح جس دریا دلی سے روپیہ خرچ کر رہے ہو ...... اس سے بہت خوشی ہوئی اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تم جا بجوں کو اس نے ایسا عالی ہمت اور فیاض اور ایک دوسرے کا ہمدم اور ہمدرد پیدا کیا۔ سخاوت، حیا اور ہمت کا یہ جوہر خدا کی بہت بڑی نعمت ہے تم سب کو ملی ہے۔ مجھے امید ہے ربّی حسب معمول وہاں کی زندگی اور تمہارے اور رضی کی حمایت سے پورے طور پر نازہ اٹھاتی ہوگی اور بچوں کی تعلیم و تربیت بہتر ماحول میں ہوتی ہوگی۔ ایسا مفید اور سازگار ماحول شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو جیسا میں نے اس کے لئے بار بار لکھا ہے کہ وہ اپنے دیار کی خراب باتوں کو ترک کرے اور وہاں کی اچھی باتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار کرے یعنی وہ دونوں جگہوں کے بہتر کو قبول کرے اور بدتر کو ترک کرے۔ اب تھک گیا تمہاری اور رضی کی امتحانات میں غیر معمولی کامیابی سُنکر بہت خوشی ہوئی اور تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ سب کو دعا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی"

دوسرے خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

"ڈیر مطیع:

...... ڈاکٹر جمیل کی معرفت تم نے پارکر کی بہت خوبصورت اور بال پن میرے لئے بھیجی ...... فصیح سے معلوم ہوا کہ اسی طرح کے کئی تحفے تم خاندان کے تمام افراد کے لئے لائے تھے ...... شرافت، سخاوت، سعادت کی یہ باتیں مسلمانوں کا کبھی نشان امتیاز سمجھی جاتی تھیں ...... اس سے اندازہ ہوا کہ تم سب ایک دوسرے کا کس درجہ خیال کرتے ہو اور اچھے سے اچھا کام کرنے میں کس طرح ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔ یہ سعادتمندی بہترین شکر گذاری ہے جو تم اللہ کو پیش کر سکتے ہو جس نے تم کو فراغت اور فراوانی دی ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے اور دعا کرتا ہوں کہ تم سب میں یہ صفات ترقی کرتی رہیں اور خاندان کا نشان امتیاز بن جائیں۔ ادھر تم سب کے نیکی کے کاموں کا جو میں نے ذکر کیا ہے اس میں یقیناً تم دونوں کی بیویوں کا بہت بڑا حصہ ہے ...... ربّی کو تم بتا دو اور صالحہ کو فصیح کرا دو کہ اولاد پر والدین اور خاندان کی یہ بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اول اللہ کر کی خوبیوں کی حقیقی امانت دار ہیں اور اپنی اولاد کو ایسی تربیت دیں کہ وہ اس امانت میں اضافہ کر کے آگے بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ جو نعمت دیتا ہے اس کا ٹیکس بڑی خوشی اور پابندی سے ادا کرنا چاہئے۔ اس میں بڑی برکت ہے خدا جس کو جو نعمت دیتا ہے وہ اسی کے لئے نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو جو اس کے محتاج ہوں پہنچانا بھی ہوتا ہے اللہ کا شکر ہے کہ تم سب بھائی خدا کی اس مصلحت کو سمجھتے ہو اور اس پر عمل کرتے ہو ...... مالی معارف کے اعتبار سے آئندہ ۴-۵ سال بڑے امتحان اور آزمائش کے گذریں گے۔ اس کا خیال آتا ہے تو بڑے تردد اور تذبذب میں پڑ جاتا ہوں لیکن اس سے تقویت پہنچتی رہتی ہے کہ اس کو پورا کرنے والا اللہ ہے جس کی رحمت اور قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اسلئے اس پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ وہ ہر بات پر قادر ہے بالخصوص نیک کام کا انجام دینے پر۔ ربّی سلمہا پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نیاز کی بیٹی ہے اور نیاز کی زندگی عام طور پر اور مسلسل ایسی ہی رہی ہے ...... ایسے باپ کی روایات کو زندہ اور برتر رکھنا بڑے بڑے لوگوں کے بس کی بات نہیں چہ جائیکہ غریب ربّی اس سے کہو کہ وہ اللہ پر بھروسہ کرے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں گا۔ بچوں کی پوری ذمہ داری اس کے سر ہے۔ اس کو برابر یاد رکھے۔ مجھے خدا کی ذات سے کامل امید ہے کہ وہ ربّی اور تمہاری اس بات میں ضرور مدد کرے گا۔ خط طویل ہو گیا ہے۔ اب ذہنی اور جسمانی کوئی محنت بھی برداشت نہیں ہوتی۔ جلد تھک جاتا ہوں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بہرحال اب تم کو سب کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ حافظ و ناصر ہے۔ آمین

تمہارا
رشید احمد صدیقی

آخر میں لکھتے ہیں:-

"مجھے امید ہے کہ تم امریکہ میں ایک اچھے مسلم اور مسلم گھرانے کی روایت زندہ رکھوگے دعا ہے کہ وہ تمہاری کامیابی اور شہرت بڑھائے تمہاری دیکھا دیکھی!! فصیح نے مجھے بہت قیمتی سنہری بال پن پنسل دی اور پارکر نفیس قلم۔ قلم کو میں نے اس لئے واپس کر دیا کہ ہاتھ کانپنے کی وجہ سے اس کی گرفت قابو میں نہیں رہتی۔ نب کا Adjustment نہیں درست رہتا ...... کوئی بہت ہی معقول آدمی ملا تو تم دونوں کے بدلے تحفہ کے طور پر دوں گا۔ میرے لئے تو ۸ آنہ کا ایک قلم اور روشنائی کافی ہوتا ہے۔"

ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم کو چھوٹوں سے بے پایاں محبت تھی۔ اچھے کاموں کے قدردان تھے۔ خوش حالی اور تکلیف میں خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے دوسروں کے کام آنے پر کس قدر مسرور ہوتے، مشرق و مغرب کی اچھائیوں کو اپنانے کی تاکید فرماتے، برائیوں کے ترک کرنے کا مشورہ دیتے۔ ہر قسم کی ہمت افزائی فرماتے مصنوعی اور تعیش کی زندگی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ سادگی اور زندہ دلی سے برابر کام لیتے۔ وہ حقیقتاً ایک صوفی صافی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اللہ تو مرحوم کی خاک پاک پر رحمت کی بارش فرمائے اور نیکیوں کو قبول فرمائے۔ آمین

مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے (احسان رشید، جلال رشید) اور دو بیٹیاں ہیں (ذکیہ رشید، عذرا رشید) اللہ ان سبکو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین